Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱۶ دسمبر ۲۰۱۸ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۱ ۔ شمارہ نمبر: ۲۴

پندرہ روزہ معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

۱۹۷۱ء: فسانہ اور حقیقت

افراسیاب مہدی ہاشمی

(سابق پاکستانی ہائی کمشنر برائے بنگلا دیش)

بھارت کی مدد سے عوامی لیگ جب بھی بنگلا دیش کا اقتدار سنبھالتی ہے، ۱۹۷۱ء کے حوالے سے پاکستان پر سنگین الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں سابق مشرقی پاکستان میں تعینات کیے جانے والے پاکستانی فوجیوں نے ۳۰ لاکھ بنگالیوں کو قتل کیا اور ۲ لاکھ بنگالی عورتوں کی حرمت کو داغدار کیا۔ یہ پروپیگنڈا بھارت کے خفیہ ادارے ''را'' کی ایماء پر کیا جاتا ہے۔

بنگلا دیش کے اندر اور باہر بہت سے لوگ ہیں جو اس پروپیگنڈے پر یقین نہیں رکھتے۔ بہت سوں کو اس حوالے سے بیان کیے جانے والے اعداد و شمار کے درست ہونے کا ذرا بھی یقین نہیں۔ بھارت کی ہندو اسکالر شرمیلا بوس نے اپنی کتاب ''دی ڈیڈ ریکننگ'' میں لکھا ہے کہ بنگلا دیش کے قیام کی تحریک کے دوران اگر ہلاکتیں ہوئی بھی ہوں گی تو زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ اور اُن میں بھی بنگالی، غیر بنگالی، ہندو، مسلم، بھارتی و پاکستانی سبھی شامل ہوں گے۔

بنگلا دیش کے پہلے سیکرٹری خارجہ سید اے کریم کہتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلا دیش کے قیام کی تحریک کے دوران مارے جانے والوں کی تعداد تیس لاکھ بتائی جو انتہائی زائد ہے اور حقیقت سے میل نہیں کھاتی۔ پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر گیری باس کہتے ہیں کہ ایک سینئر بھارتی فوجی افسر نے یہ کہا تھا کہ بنگلا دیش کے قیام کی تحریک کے دوران تین لاکھ (تیس لاکھ نہیں) مارے گئے ہوں گے۔ اس وقت کے بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ نے یہ بات اچک لی اور کہہ دیا کہ بنگلا دیش میں کم و بیش دس لاکھ افراد مارے گئے ہیں۔ ناروے کے دی پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کہنا ہے کہ بنگلا دیش کے قیام کے وقت تقریباً ۵۸ ہزار ہلاکتیں واقع ہوئیں۔ سوئیڈن کے صحافی انگ وَر راوجانے ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا کہ تیس لاکھ ہلاکتوں کا دعوٰی مبالغے کی انتہا ہے۔ برطانوی اخبار دی ٹیلی گراف میں پیٹر گل نے ۱۶/اپریل ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں لکھا کہ پاکستانی فوج ایک بغاوت کو کچل رہی تھی۔ اس نے کسی بیرونی سرزمین پر قبضہ نہیں کر رکھا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے مطابق پاکستانی فوج نے دس ماہ کے دوران تیس لاکھ بنگالیوں کو قتل کیا۔ یہ اعداد و شمار اگر پچاس ساٹھ گنا نہیں تب بھی تقریباً بیس گنا زائد تو ہیں ہی۔

پاکستانی فوج پر بنگالی خواتین کی آبروریزی سے متعلق دعوے بھی بے بنیاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانیوں کی وردی میں بھارتی فوجیوں نے یہ انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نومبر ۱۹۷۱ء میں رمضان المبارک تھا۔

ہتھیار ڈالنے والے پاکستانی فوجیوں کی تعداد کے حوالے سے بھی انتہائی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۹۰ ہزار یا پھر ۹۳ ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈالے۔ یہ اعداد و شمار بالکل غلط ہیں۔ جنرل اے کے نیازی نے اپنی کتاب ''دی بیٹریئل آف ایسٹ پاکستان'' میں لکھا ہے کہ ان کی کمان میں لڑنے والے فوجیوں کی تعداد ۳۴ ہزار سے زائد نہ تھی۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہتھیار ڈالتے وقت یہ تعداد ۹۰ ہزار یا اس سے زائد کیسے ہوگئی۔ شرمیلا بوس بھی اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ اے کے نیازی کے دیئے ہوئے اعداد و شمار بالکل درست ہیں۔ بنگلا دیش، بھارت، امریکا اور دیگر ممالک میں غیر جانب دار مبصرین اس بات کے قائل ہیں کہ سابق مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج اور مکتی باہنی سے لڑنے والے پاکستانی فوجیوں کی تعداد ۳۵ ہزار سے زائد نہ تھی۔

۹۰ ہزار افراد کو قیدی بنائے جانے کی بات البتہ درست ہو سکی ہے۔ ان میں ۳۵ ہزار فوجی ہوں گے۔ ان کے علاوہ غیر بنگالی سویلین ملازمین، سول انجینئرز، ڈاکٹرز اور ان کے اہل خانہ کو بھارت لے جایا گیا ہوگا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ۳۵ ہزار پاکستانی فوجیوں نے سابق مشرقی پاکستان میں کم و بیش ۲ لاکھ بھارتی قابض فوجیوں اور انہی سے تربیت پائے مکتی باہنی کے ڈیڑھ لاکھ سے زائد باغیوں کا سامنا کیا۔

یہ پروپیگنڈا بھی بہت زور و شور کیا جاتا ہے کہ جب سابق مشرقی پاکستان بنگلا دیش نہیں بنا تھا یعنی پاکستان کا حصہ تھا تب وہاں ترقی نہیں ہوئی تھی یعنی وفاق نے اسے نظر انداز کر رکھا تھا۔ یہ بھی سراسر بے بنیاد بات ہے۔ پاکستان نے

اندرونی صفحات پر:۔

- نیا چینی عالمی نظام؟
- ''چپ وار''
- جنگی جنون کی بھاری قیمت
- دو جان یک قالب
- میرے آغاز میں میرا انجام پوشیدہ ہے!
- نیتن یاہو ''سفارت کاری''

گوادر میں بندرگاہ کی تعمیر اب شروع کی ہے۔ صدر ایوب کے دور میں بنگلا دیش میں منگلا کی بندرگاہ تعمیر کی گئی تھی۔ صدر ایوب ہی کے دور میں مغربی پاکستان میں صرف حسن ابدال میں کیڈٹ کالج کھولا گیا تھا جب کہ سابق مشرقی پاکستان میں چار کیڈٹ کالج کھولے گئے تھے۔ چاٹگام میں ۱۹۵۸ء میں، جھینیدا میں ۱۹۶۳ء میں، راجشاہی اور ٹنگالی میں ۱۹۶۵ء میں۔ کراچی سے پہلے پاکستان ٹیلی ویژن نے ڈھاکا سے نشریات کا آغاز کیا۔ یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ پاکستان میں تربیلا ڈیم تعمیر کیا گیا تو سابق مشرقی پاکستان میں کپتال ڈیم تعمیر کیا گیا۔ جب مغربی پاکستان میں کوئی اسٹیل مل نہیں تھی تب سابق مشرق پاکستان میں اسٹیل مل قائم کی گئی۔ واضح رہے کہ کراچی میں اسٹیل مل ملک کے دولخت ہونے کے بعد قائم کی گئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں صرف ایک مسلم بنگالی آئی سی ایس افسر تھا جس کا نام نورالنبی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سی ایس پی افسران، سفارت کاروں اور مختلف سروس گروپس سے تعلق رکھنے والے بنگالیوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یہ سب کچھ پاکستان کے سول سروس اسٹرکچر کا کرشمہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں برٹش آرمی (بری، بحری اور فضائی فوج تینوں میں) سے تعلق رکھنے والے مشرق پاکستان کے افسران کی تعداد ۱۲ تا ۱۵ تھی۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے اعلیٰ ترین فوجی اداروں سے تربیت پانے کے بعد پاکستانی فوج میں خدمات انجام دینے والے سابق مشرقی پاکستان کے بنگالی افسران کی تعداد ہزاروں میں تھی۔

مشرقی پاکستان ۲۴ سال پاکستان کا حصہ رہا۔ اس دوران وہاں سے تعلق رکھنے والی چار شخصیات نے سربراہِ حکومت وریاست کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنایا گیا۔ اسکندر مرزا نے ۱۹۵۶ء میں صدرِ پاکستان کا منصب سنبھالا۔ محمد علی بوگرا ۱۹۵۳ء میں وزیراعظم بنائے گئے اور ان کے بعد ۱۹۵۶ء میں حسین شہید سہروردی بھی وزیراعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ علاوہ ازیں نورالامین پہلے نائب صدر اور ۱۹۷۱ء میں عبوری وزیر اعظم مقرر کیے گئے۔ بھارت میں مغربی بنگال کے نام سے الگ ریاست یا صوبہ ہے مگر وہاں سے اب تک کسی کو وزیر اعظم منتخب نہیں کیا گیا۔ ۲۰۱۲ء میں پرنب مکھرجی پہلے بنگالی تھے جنہیں صدرِ مملکت منتخب کیا گیا۔

کم ہی لوگ جانتے ہوں کہ فروری ۱۹۴۸ء میں دھیریندر دتہ پہلے بنگالی اور ہندو تھے جنہیں آئین ساز اسمبلی میں بنگالی میں اظہارِ خیال کی اجازت دی گئی۔ دھیریندر دتہ نے صرف ۶ ماہ قبل پاکستان کے قیام کی شدید مخالفت کی تھی۔ وہ تو ۱۹۰۵ء میں بنگال کو تقسیم کیے جانے کے بھی شدید مخالف تھے۔ واضح رہے کہ ہندوؤں کی جانب سے استحصال سے بچنے کے لیے اس تقسیم کا مطالبہ بنگالی مسلمانوں نے کیا تھا۔

قیام کے بعد سے بنگلا دیش نے جو ترقی کی ہے ہم اسے استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اقوام متحدہ نے بنگلا دیش کو سب سے کم ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں رکھا ہے۔ اگر سب کچھ درست رہا تو امکان ہے کہ ۲۰۲۴ء میں بنگلا دیش اس فہرست سے نکل جائے گا۔ یاد رہے کہ پاکستان کبھی اس فہرست کا حصہ نہیں رہا۔

بھارت کے نام نہاد دانشور اور اسکالرز یہ راگ الاپتے نہیں تھکتے کہ بنگلا دیش کے قیام کے دن ہی محمد علی جناح کا دو قومی نظریہ دم توڑ گیا۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بنگلا دیش نے بھارت میں ضم ہونے کا اعلان کیا ہے نہ اس کا کوئی امکان دکھائی دیتا ہے۔ پاکستان ۱۹۷۱ء میں دولخت ہوا۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ بنگلا دیش ایک حقیقت ہے اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج بھی بنگلا دیش کے بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں پاکستانیت زندہ ہے۔

پاکستان کو دولخت کرنے میں کلیدی کردار بھارت نے ادا کیا۔ بھارت کا یہ کردار طشت از بام ہوتے ہی بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں بھارتیوں کے لیے نفرت پیدا ہوئی۔ آج بہت سے بنگلا دیشی بنگالی مسلمان اپنی نجی گفتگو میں بھارتیوں کو ملعون قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف بھارتیوں کا کہنا ہے کہ بنگلا دیشی روئے ارض پر سب سے ناشکری قوم ہیں۔ وہ بنگلا دیشیوں کے لیے کاکروچ (لال بیگ) کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

سابق مشرقی پاکستان کے مسلم بنگالیوں نے خود کو زبان اور ثقافت کی بنیاد پر الگ کیا۔ بھارت نے پروپیگنڈا کے محاذ پر بہت زور لگایا اور مشرقی پاکستان کے عام بنگالی کے ذہن میں یہ بات ٹھونس دی کہ اگر کوئی اس کا ہے تو بنگالی بولنے والا ہندو۔ دل خراش حقیقت یہ ہے کہ آج بھی مسلم بنگالیوں اور ہندو بنگالیوں کے درمیان صرف مذہب کا فرق نہیں بلکہ ثقافت اور رسم ورواج کا فرق بھی ہے۔ دونوں کے رہن سہن میں پایا جانے والا فرق اب تک ختم نہیں ہوا۔ ہندو بنگالیوں کا لباس تک الگ ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جن پر کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔

پاکستان کا دولخت ہونا ایسی حقیقت ہے جس پر انتہائی دکھ تو محسوس کیا جاسکتا ہے مگر اس دل خراش حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال، یہ سانحہ اعلیٰ سطح کی چند سیاسی اور انتظامی شخصیات کی نااہلی اور لاپروائی کا نتیجہ تھا۔ سابق مشرقی پاکستان اور سابق مغربی پاکستان میں عام آدمی کا اس سانحے سے کچھ لینا دینا نہیں تھا، وہ کسی بھی درجے میں قصوروار نہ تھا۔ آج پاکستان ایک آزاد مسلم ریاست ہے اور بنگلا دیش بھی اسی درجے پر فائز ہے۔ دونوں الگ ہیں مگر ایک ملت کا حصہ ہیں۔ دادو میاں، حاجی شریعت اللہ اور تیتو میر مسلم بنگالی ہیرو ہیں۔ انہیں پاکستان میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ شیر بنگال ابوالقاسم فضل الحق نے لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس وقت کے منٹو پاکستان میں (جہاں آج مینارِ پاکستان قائم ہے) قراردادِ پاکستان پیش کی تھی۔ انہیں آج بھی پاکستان اور بنگلا دیش دونوں ممالک میں انتہائی احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ بنگال کے عظیم اسکالر سید امیر علی کو آج بھی پاکستان میں احترام حاصل ہے۔

بنگلا دیش بہرحال ایک حقیقت ہے اور ہمیں یہ حقیقت تسلیم ہے۔ ہمیں اپنی اغلاط اور کوتاہیوں سے سیکھنا چاہیے۔ اب دونوں ممالک کو بہتر تعلقات استوار کرنے چاہئیں تاکہ مخاصمت کی فضاء ختم ہو اور دونوں ممالک کے مسلمان واقعی ایک امت کا حصہ بن سکیں۔

(مصنف بنگلا دیش میں پاکستان کے سابق ہائی کمشنر ہیں۔ انہوں نے اس حیثیت سے ۲۰۱۱ء تا ۲۰۱۴ء خدمات انجام دیں۔ زیرِ نظر مضمون ان کی کتاب ''۱۹۷۱ء: فیکٹ اینڈ فکشن'' سے لیا گیا ہے، جو خورشید پبلشنگ ہاؤس، اسلام آباد نے اپریل ۲۰۱۶ء میں شائع کی۔)

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین وحضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضاکارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِخریداری موصول ہوجانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ!

نیا چینی عالمی نظام؟

Nathan Gardels

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا نے اپنی قیادت میں ایک عالمی نظام تیار کیا اور اُسے کم وبیش سات عشروں تک چلایا۔ اب امریکی قیادت اور پالیسی سازوں نے طے کیا ہے کہ یہ نظام مزید چلایا نہیں جاسکتا۔ امریکا نے معاملات سے ہاتھ اٹھانا شروع کیا ہے تو چین نے سامنے آکر ایک ایسا نظام تیار کرنے کی تیاری شروع کردی ہے، جس کی سربراہی اُس کے ہاتھ میں ہو۔

امریکا کے بعد کی دنیا میں بہتر انداز سے آگے بڑھنے کے لیے چین جو کچھ کر رہا ہے، وہ اب واضح ہوتا جارہا ہے۔ چین نے ایسے ادارے بھی تیار کرلیے ہیں، جو بیرون ملک سرمایہ کاری اور دیگر متعلقہ اقدامات کے حوالے سے اپنا کردار خوب ادا کر رہے ہیں۔ ایشین انفرا اسٹرکچر اینڈ انویسٹمنٹ بینک سے بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹیو اور پھر ایک اور سیٹ اپ کے ذریعے مشرقی یورپ اور بلقان کے خطے میں سرمایہ کاری اور بنیادی ڈھانچے کی تعمیر سے متعلق منصوبے تیزی سے سامنے آرہے ہیں۔ چین شمسی توانائی اور پون بجلی کے ایسے عالمگیر گرڈ کی بھی تیاری کر رہا ہے، جس کے ذریعے ایک طرف تو پائیدار ترقی کو ممکن بنایا جاسکے اور دوسری طرف ماحول کو پہنچنے والے نقصان کا گراف بھی نیچے رکھنا ممکن ہو۔

نیا عالمی نظام پرانے یعنی موجودہ عالمی نظام جیسا نہیں ہوگا۔ اب تک تو کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ چینی قیادت بھرپور کوشش کر رہی ہے کہ چند کام کے ممالک سے دوطرفہ تعلقات استوار کیے جائیں اور پھر ان تعلقات کو آپس میں جوڑ کر ایک ایسا نظام تیار کیا جائے، جس کے مرکز میں چین ہو۔ چین نے اب تک ''ایک دنیا، بہت سے نظام'' کے تصور کو گلے لگایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ چین کے تحت معرضِ وجود میں آنے والے عالمی نظام میں اقدار سے زیادہ مفادات کی اہمیت ہوگی۔

امریکی کالم نگار جارج ایف وِل کہتے ہیں کہ امریکی صدر کو اب دنیا کی طاقتور ترین شخصیت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے چینی ہم منصب ژی جن پنگ کے مقابل اپنی کمتر حیثیت قبول کرلی ہے اور ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ان کی معاشی پالیسی بھی اس نوعیت کی ہے کہ چین کے مقابل کوئی بڑا ایڈوانٹیج حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ چینی صدر شی جنگ پنگ نے اب تک ایسا کوئی اشارا نہیں دیا کہ چین باقی دنیا کو یا کمزور ممالک کو ہڑپ کر جانا چاہتا ہے۔ انہوں نے اب تک ایک ایسے مستقبل کی بات کہی ہے، جس میں سبھی مل کر رہیں اور کسی سے بھی غیر ضروری یا غیر معمولی حق تلفی نہ ہو۔ دوسری طرف چین کے کٹّر مخالف ناقدین اور تجزیہ کار کہتے ہیں کہ چین جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ معاشی سطح پر ہے۔ چین کو اس وقت اضافی پیداوار کے مسئلے کا سامنا ہے۔ اُسے نئی اور مضبوط منڈیوں کی تلاش ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے، جب وہ معاشی اقدامات کھل کر کرے۔ یہ ناقدین کہتے ہیں کہ چین کو صرف نئی منڈیاں درکار ہیں تاکہ اپنی سُست پڑتی ہوئی معیشت کو سہارا دے سکے۔

چین کو اس وقت دو بڑے مسائل کا سامنا ہے۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ جن ممالک سے اس نے دوستی بڑھائی ہے اور اشتراکِ عمل کا سوچا ہے اُن پر اُس کے دیے ہوئے قرضوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ اور دوسرا مسئلہ اس تاثر کا ہے کہ چینی ادارے جہاں بھی کاروبار کر رہے ہیں، وہاں سیاست دانوں اور پالیسی سازوں کو رشوت دے رہے ہیں تاکہ اپنی مرضی کے فیصلے اور پالیسیاں یقینی بنا سکیں۔ سری لنکا میں چین نے ایک بندرگاہ تعمیر کی اور اب اس کا کنٹرول حاصل کرلیا ہے کیونکہ سری لنکا قرضے واپس کرنے کی پوزیشن میں ہے ہی نہیں۔ پاکستان (گوادر پورٹ) اور لاؤس میں بھی ایسی ہی صورتِ حال ابھرتی دکھائی دے رہی ہے۔ ملائیشیا میں نئی حکومت نے ایک ریل منصوبہ یہ کہتے ہوئے روک دیا ہے کہ رشوت کی شکایات ہیں اور سابق حکومت نے ایسی شرائط پر یہ منصوبہ شروع کیا تھا جو قومی مفادات سے ہم آہنگ نہ تھیں۔

اس گمان میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ چین کی پالیسیاں زیادہ خطرناک نہیں اور اپنے قومی مفادات تک محدود ہیں، مگر خیر، دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ اور امریکا کو غیر معمولی فوائد سے ہم کنار کرنے والے مارشل پلان کے حوالے سے جوزف اسٹالن نے جو رویہ اپنایا وہ رویہ اپنانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امریکا نے انیسویں صدی میں مغرب کی سمت ریل روڈ کو توسیع دی تو بدعنوانی بھی پھیلی اور قرضوں کا بوجھ بھی بڑھا۔ بعد میں جب معاملات درست ہوئے تو امریکا کو بہرحال اس رجحان سے فائدہ ہی پہنچا۔

بہت سی خرابیوں کے باوجود آج سے بیس سال بعد یوریشیا اور افریقا کو بھی چین کے موجودہ اقدامات اور پالیسیوں سے فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس پورے عمل کو خرابیوں سے بچانے کی ایک ہی صورت ہے۔ مغرب کو چین کے ساتھ مل کر یہ تمام منصوبے مکمل کروانے چاہییں تاکہ بدعنوانی کی گنجائش کم ہو، کسی بھی کمزور ملک یا خطے پر قرضے کا غیر معمولی دباؤ مرتب نہ ہو اور کسی کو یہ محسوس نہ ہو کہ قرضوں کے اجرا کے ذریعے نیا نوآبادیاتی نظام یقینی بنایا جارہا ہے۔ ایشین انفرااسٹرکچر اینڈ انویسٹمنٹ بینک نے جو منصوبے شروع کیے ہیں، اُن میں کئی مغربی ممالک بھی شریک ہوچکے ہیں۔ امریکا اب تک دور دور ہے۔ کئی دوسرے مغربی ممالک بھی امریکا کی پیروی کرتے ہوئے ان منصوبوں سے فاصلہ رکھے ہوئے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ امریکا اور یورپ دونوں ملک کر چین کے ساتھ ان منصوبوں میں شریک ہوں تاکہ شفافیت یقینی بنائی جاسکے اور جو کچھ بھی ہو وہ باہمی رضامندی سے ہو یعنی کسی بھی نوع کی رنجش اور مخاصمت کی گنجائش ہی پیدا نہ ہو۔

اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مغربی اقوام دنیا بھر میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر و ترقی پر کچھ زیادہ خرچ کرنے کے موڈ میں نہیں۔ یہ بات بتانے کی کچھ خاص ضرورت تو نہیں کہ امریکا اب اس پوزیشن میں نہیں کہ اپنی حدود میں بھی کوئی ایک ہائی اسپیڈ ریل پراجیکٹ لگا سکے۔ مجموعی طور پر معاملہ یہ ہے کہ امریکا موجودہ بنیادی ڈھانچے کو ڈھنگ سے درست حالت میں لانے کے قابل بھی نہیں۔ ایسے میں نئے بنیادی ڈھانچے کے لیے سرمایا کاری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یورپی یونین اس بات پر اندرونی الجھنوں کا شکار ہے کہ بڑے پیمانے پر مالیات کے مسئلے سے کس طور نمٹے۔ بہت سے بڑے منصوبوں کے لیے مالیات کا بندوبست کرنا آسان نہیں رہا۔ یورپی یونین کے بیشتر ارکان چاہتے ہیں کہ بجٹ کی حدود میں رہتے ہوئے کام کیا جائے۔ بہت سے ممالک اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ جب انہیں بحران کا سامنا تھا تب امریکا اور یورپی یونین نے ہری جھنڈی دکھادی مگر چین نے ساتھ دیا۔ یونین کے سابق صدر جارج پاپاپائیندرو کہتے ہیں کہ چین نے یونین کے مالیاتی

بحران کو حل کرنے میں غیر معمولی حد تک ساتھ دیا۔ یونان کے سوورین بونڈز خریدنے والے چند ممالک میں چین سرِفہرست تھا۔ یہ گویا یونان کے حق میں چین کی طرف سے اعتماد کا ووٹ تھا۔ یونان کو مالیاتی بحران میں سہارے کی ضرورت تھی اور سہارا چین نے دیا۔ ایسے میں یونان کی قیادت امریکا اور یورپی یونین کی طرف دیکھنے کی زحمت کیوں گوارا کرے گی؟ چین نے یونان کی بندرگاہ Piraeus میں بڑے پیمانے پر سرمایا کاری بھی کی ہے۔ یہ گویا نئی بحری شاہراہِ ریشم کی قیام کی سمت پہلا بڑا قدم تھا۔ جب چین نے آگے بڑھ کر یونان کی معیشت پر اعتماد کا اظہار کیا تو یونانی قیادت کو بھی حوصلہ ملا اور یوں مالیاتی بحران ختم کرنے میں غیر معمولی مدد ملی۔

آج کی دنیا میں ایک بڑا مسئلہ عالمی نظام کے حوالے سے خلا کا ہے اور چین اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ امریکا اور یورپی یونین نے مجموعی طور پر ہاتھ اٹھالیا ہے۔ امریکا کی اپنی معاشی حالت ایسی نہیں کہ وہ معاملات کو درست کرنے کی سمت بڑھ سکے۔ یورپی یونین نے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ وہ کوئی بھی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی، جس سے معاملات خرابی کی طرف جائیں۔ عالمی سیاست و معیشت میں یورپی یونین اپنے لیے ایک لگا بندھا کردار چاہتی ہے۔ امریکا کی مہم جوئی سے وہ اب اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے کی راہ پر گامزن ہے۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ اس وقت عالمی سیاسی و معاشی نظام جس خرابی سے دوچار ہے، وہ صدر ٹرمپ کے اقدامات کا پیدا کردہ نہیں بلکہ امریکا کی اپنی کامیابیوں کا پیدا کردہ ہے۔ امریکا نے غیر معمولی طاقت جمع کر کے بہت سی خرابیوں کو راہ دی اور اب ان خرابیوں کے انتہائی بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک ایسا عالمی نظام درکار تھا جو بڑی طاقتوں کے درمیان کسی اور بڑی جنگ کی راہ مسدود کرے۔ امریکا اور یورپی یونین نے یہ مقصد حاصل تو کر لیا مگر اس دوران امریکا نے اتنی زیادہ طاقت حاصل کر لی کہ اس کے لیے اپنے وجود کو سنبھالنا انتہائی دشوار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ پالیسیوں کے عدم توازن کی شکل میں برآمد ہوا۔ آج امریکا پالیسیوں کے شدید عدم توازن کے نتائج بھگت رہا ہے۔ اس نے بہت سے معاملات میں ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔ اب وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہا ہے۔

امریکا نے عالمی تجارت کو زیادہ سے زیادہ آزاد بنانے پر توجہ دی۔ اس کا فائدہ چین کو بھی پہنچا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چین نے عالمی تجارت کے آزاد ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ تجزیہ کار کہتے ہیں کہ عالمی نظام کو بہتر طور پر کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے فوری طور پر جو اصلاحات درکار رہا کرتی ہیں وہ نہیں کی جا رہیں۔ کئی عشروں سے معاملہ یہ ہے کہ عالمی نظام سے فائدہ تو اٹھایا جا رہا ہے، اُسے مضبوط بنائے رکھنے پر توجہ نہیں دی جا رہی۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ معاملات الجھتے ہی گئے ہیں۔

جن ممالک کو موجودہ عالمی نظام سے شدید نقصان پہنچا ہے وہاں عوام نے سڑکوں پر آ کر اس نظام کو چیلنج کیا ہے۔ کئی ممالک میں عوام کے لیے شدید معاشی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ اس خلا کو پُر کرنے پر کسی اور سے زیادہ چین نے توجہ دی ہے۔ روس، ترکی اور دیگر ممالک کے ساتھ مل کر وہ اپنی عالمی پوزیشن مستحکم تر کرتا جا رہا ہے۔ یورپی یونین نے میدان خالی چھوڑنے کو ترجیح دی ہے۔ اس کی اندرونی پیچیدگیاں اِتنی زیادہ ہیں کہ فی الحال عالمی سطح پر وہ کسی بڑی مہم جوئی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ نئے عالمی نظام کی بھرپور گنجائش موجود ہے۔ دنیا اب امریکا پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں۔

معروف سیاسی تجزیہ کار ایلی وائن کا کہنا ہے کہ جب بھی کوئی عالمی نظام دم توڑتا ہے اور نیا لایا جاتا ہے تب خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پورے پورے خطوں کو لپیٹ میں لینے والی جنگیں بھی ہوتی ہیں۔ ہم جوہری ہتھیاروں کے دور میں جی رہے ہیں۔ ایسے میں یہ سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ اگر نئے عالمی نظام کی تیاری اور نفاذ کے دوران کوئی عالمی جنگ چھڑ گئی تو کیا ہوگا۔

جوناتھن ہل مین کہتے ہیں کہ امریکا اور یورپ کے پیدا کردہ خلا کو پُر کرنے کے لیے چین تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، اس کا دی بیلٹ اینڈ روڈ انیشیئیٹو جیو پولیٹیکل ایڈورٹائزنگ میں ماسٹر اسٹروک ہے۔ اگر یہ منصوبہ طے کردہ خاکے کے مطابق مکمل ہو گیا تو امریکا اور یورپ دونوں کے لیے مشکلات اِتنی بڑھ جائیں گی کہ چین سے لڑے بغیر اُس کے آگے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ شاہراہِ ریشم کی دیومالا کو آگے بڑھانے کی بات کرتے ہوئے چین کے صدر شی جن پنگ بہت تیزی سے ایک ایسی دنیا کی راہ ہموار کر رہے ہیں، جس میں مرکزی حیثیت چین کی ہو، تمام اہم فیصلے چین کی پالیسیوں کے گرد گھومتے ہوں۔ چین دنیا بھر میں بنیادی ڈھانچے کو مضبوط تر بنانے پر توجہ دے رہا ہے۔ جن ممالک کی معیشت کمزور ہے، وہ اپنے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرنے میں چین سے مدد لے رہے ہیں۔ جن وسائل سے وہ اپنے طور پر مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اُن سے مستفید ہونے میں وہ چین کا سہارا لے رہے ہیں۔

جوناتھن ہل مین کہتے ہیں کہ متعدد ممالک کی بدعنوان قیادت چین کے ساتھ مل کر کام تو کر رہی ہے مگر یہ طریقہ زیادہ کارگر ثابت نہ ہوگا۔ کسی قوم کو حقیقی ترقی کے لیے شفافیت درکار رہا کرتی ہے۔ اگر کرپٹ قیادتیں چین کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں گی تو متعلقہ ممالک کے عوام کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا اور اس کے نتیجے میں شدید اضطراب پیدا ہوگا۔

چین نے دنیا بھر میں جو سرمایا کاری کی ہے، وہ اتنی زیادہ ہے کہ اب بہت سے ممالک یہ سوچ کر خوفزدہ ہیں کہ اگر چینی قیادت نے اس سرمایا کاری کو قومی مفادات کے لیے بروئے کار لانا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ بہت سے افریقی ممالک میں آئل فیلڈز کا ۴۰ فیصد حصہ چین نے خرید رکھا ہے۔ سری لنکا سمیت کئی ممالک میں چین کی تعمیر کردہ بندرگاہیں اب چینی مفادات کے لیے استعمال کی جا رہی ہیں۔ امریکا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ اس نے ترقی کے عمل میں بنیادی حقوق کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ چین بھی فی الحال اسی راہ پر گامزن دکھائی دیتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکا اور یورپ نے آگے بڑھنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے، وہی چین نے بھی اختیار کیے ہیں۔ ایک زمانے سے امریکا اور یورپ کی بھرپور ترقی کا مدار جدید علوم و فنون کے حوالے سے پیش رفت پر رہا ہے۔ امریکا میں جدید ترین علوم و فنون کے حوالے سے تحقیق کو وفاقی ڈھانچے سے جوڑا جاتا رہا ہے تاکہ جو کچھ بھی نیا سامنے آئے اس کا بھرپور معاشی فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہی طریقہ یورپ نے بھی اپنایا۔ یورپ سے یہ طریق ایشیا پہنچا، جہاں سب سے زیادہ اثرات جاپان میں رونما ہوئے۔ اور اب چین بھی جدید ترین علوم و فنون کے حوالے سے تحقیق کے ذریعے آگے بڑھنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"China is laying the groundwork for a post-American world order".
("Washington Post". July 27, 2018)

| | |

’’چِپ وار‘‘

امریکا چین تجارتی تنازعات اب معمولی نوعیت کے محسوس ہونے لگے ہیں۔اس تنازع کا مرکزی ہتھیار ’’ٹیرف‘‘ ہیں۔پرانی تجارتی منڈیاں جن میں کاروں کی صنعت سے لے کرلوہے کی صنعت تک سب اس مڈبھیڑ میں جنگ کے میدان کا کردار ادا کررہے ہیں۔’’کسان‘‘ اور’’ صنعتیں‘‘ صدرٹرمپ کے دماغ پرحاوی ہیں۔دوسری طاقتور شخصیت کے ساتھ صدر کا ذاتی تعلق اور مزاج بہت سے معاہدوں کے ہونے اور نہ ہونے پر اثر انداز ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے اس G-20 کے اجلاس کے دوران صدر’’ٹرمپ‘‘ اور صدر’’شی‘‘ کے درمیان ہونے والی ملاقات نہایت اہمیت کی حامل ہے(یہ مضمون اجلاس سے قبل شائع ہوا تھا)۔

لیکن اکیسویں صدی کے ان تجارتی تنازعات میں سب سے اہم’’ٹیکنالوجی‘‘ کے شعبے میں سبقت لے جانے کی جنگ ہوگی۔یہ جنگ’’مصنوعی ذہانت‘‘ سے لے کر’’نیٹ ورکنگ‘‘ کے آلات تک تمام شعبہ جات کو اپنی لپیٹ میں لے گی اور نیم موصّل (semi conductors) کو اس جنگ میں بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔’’چپ‘‘ (chip) کی صنعت ہی وہ صنعت ہے جہاں امریکا اپنی سبقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، اور دوسری طرف چین اس شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوششیں کررہا ہے۔یہی وہ مرکزی نکتہ ہے جہاں دونوں ممالک ایک دوسرے کے مقابل آکھڑے ہوئے ہیں۔اس لیے G-20 اجلاس میں صدرٹرمپ اور صدرشی کچھ بھی کہیں لیکن یہ تنازعہ برقرار رہے گا۔وہ اس لیے کہ’’کمپیوٹر چپ‘‘ کو اس وقت ڈیجیٹل معیشت اور قومی سلامتی کے امور میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔کاریں ٹائروں پر چلنے والے کمپیوٹر کی شکل اختیار کرچکی ہیں،بینک وہ کمپیوٹر بن چکے، جو رقم کی نقل وحرکت کا باعث بنتے ہیں۔فوجیں اپنی جنگیں لوہے کے ساتھ ساتھ’’سلی کون‘‘ سے بھی لڑرہی ہیں۔امریکا اور اس کے اتحادی ممالک کوریا اور تائیوان کی صنعتوں کو اس جدید شعبے پر غلبہ حاصل ہے۔ جب کہ چین ابھی بھی "high-end chips" کے لیے دوسرے ممالک پر انحصار کرتا ہے۔چین کی Semi conductors کی درآمد کا خرچ تیل کی درآمد کے خرچ سے بھی زیادہ ہے۔فروخت کے لحاظ سے دنیا کی پندرہ بڑی کمپنیوں میں ایک بھی چینی کمپنی شامل نہیں ہے۔

ٹرمپ کے صدارت سنبھالنے سے پہلے ہی چین اس حوالے سے اپنی منصوبہ بندی کرچکا تھا۔۲۰۱۴ء میں چین نے اپنی اس صنعت کو فروغ دینے کے لیے ایک کھرب یوآن (۱۵۰ ارب ڈالر) کا’’انوسٹمنٹ فنڈ‘‘ قائم کیا۔۲۰۱۵ء میں جاری ہونے والے "Made in China 2025" منصوبے میں بھی Semiconductors کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

اس جدید صنعت کی ترقی کے حوالے سے چین کے عزائم نے براک اوباما کو کافی پریشان کیے رکھا۔۲۰۱۵ء میں اوباما نے’’انٹیل‘‘ کو اپنی جدید ترین chips چین کو فروخت کرنے سے روک دیا تھا، اس کے علاوہ ۲۰۱۶ء میں جب ایک چینی کمپنی نے ایک چپ بنانے والی جرمنی کی کمپنی کو خریدنے کی کوشش کررہی تھی تو امریکا نے اس سودے کو رکوادیا۔اوباما کے عہدہ چھوڑنے سے پہلے وائٹ ہاؤس سے ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں ایسی چینی کمپنیوں کے خلاف اقدام کرنے کی تجاویز دی گئی تھیں جو’’ٹیکنالوجی ٹرانسفر‘‘ پر بضد تھیں۔دیگر ممالک نے بھی اسی طرح کے اقدامات کیے ہیں۔تائیوان اور جنوبی کوریا کے ہاں پہلے سے ہی اس طرح کی پالیسیاں موجود ہیں جن کے تحت چینی کمپنیوں پر جدید ترین آلات خریدنے پر پابندی لگائی گئی ہے۔

اگرچہ’’چپ‘‘ کی یہ جنگ صدر ٹرمپ کے آنے سے پہلے کی ہے،تاہم صدر ٹرمپ نے اس جنگ میں مزید تیزی پیدا کردی ہے۔انھوں نے Qualcomm کی فروخت کے حوالے سے چین کے ڈر سے سنگاپور کی کمپنی کی کی جانب سے لگائی جانے والی بولی کو مسترد کردیا۔اسی سال کے آغاز میں امریکی کمپنیوں کو اپنی "chips" اور’’سافٹ ویئر‘‘ چینی ٹیلی کام کمپنی ZTE کو فروخت کرنے پر پابندی لگائی۔جس کی وجہ سے یہ کمپنی دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ گئی تھی۔صدر ٹرمپ کے بقول چینی صدر کی اپیل پر فی الحال انھوں نے یہ فیصلہ واپس لیا ہے۔

دو باتیں اب تبدیل ہوچکی ہیں۔پہلی یہ کہ امریکا کو اس بات کا اندازہ ہے کہ اسے چین پر حاصل سبقت صرف اور صرف جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہے۔امریکا نے درآمدات کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے کافی پابندیاں لگائیں ہیں،ان ہی پابندیوں کی وجہ سے چینی کمپنی "Fujian Jinhua" بھی متاثر ہوئی،جس پر الزام تھا کہ اس نے خفیہ ٹیکنالوجی منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔اس کے علاوہ وائٹ ہاؤس نئی آنے والی ٹیکنالوجی پر مسلسل پابندیاں لگا رہا ہے۔دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ چین semi conductors کی صنعت میں خودمختاری کے حصول کے لیے مسلسل کوششیں کررہا ہے اور اس معاملے میں حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ بے پناہ مراعات بھی دے رہا ہے۔امریکا نے جب ZTE پر پابندی لگائی تو صدر شی نے اپنے ملک کی تمام بڑی کمپنیوں سے رابطہ کیا۔ چین کی تمام بڑی کمپنیاں، جن میں Alibaba,Baidu اور Huawei شامل ہیں،’’چپ سازی‘‘ پر سرمایہ لگانے کے حوالے سے یکساں موقف رکھتی ہیں اور چین نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ وہ امریکی کمپنیوں کے راستے میں حائل ہوسکتا ہے۔

دونوں ممالک کے مفادات میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آرہی۔امریکا کے خدشات بھی صحیح ہیں کہ وہ اگر’’چپ‘‘ کے شعبے میں چین پر انحصار کرے گا تو اس کی ملکی سلامتی بھی خطرے میں پڑسکتی ہے۔اسی طرح چین کا سپر پاور بننے کا خواب بھی اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ اس شعبے میں خود انحصار نہیں ہوجاتا۔چین اس دوڑ کو جیتنا چاہتا ہے۔جبکہ امریکا اس دوڑ میں اپنی سبقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ امریکا اپنے اس رویے میں کس حد تک آگے جاسکتا ہے؟ وائٹ ہاؤس کے موجودہ مقیم تو چاہتے ہیں کہ semi conductors کی مکمل فراہمی امریکا منتقل کردی جائے۔یہ اچھی سوچ ہے،لیکن عالمگیریت کے اس دور میں یہ ممکن نہیں۔امریکا کی ایک کمپنی کے ۶۰۰۰ اسپلائر ہیں،جس میں سے نصف غیرملکی ہیں۔چین بہت سی صنعتوں کے لیے مرکزی منڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ Qualcomm اپنی پیداوار کا دوتہائی چین میں فروخت کرتی ہے۔اس صنعت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے سے امریکی صنعت کار اور صارفین دونوں ہی متاثر ہوں گے۔اور یہ مخالفت میں اٹھایا جانے والا ایک ایسا قدم ہوگا جس سے اس صنعت میں موجود مسابقت کی فضا کو نقصان پہنچے گا۔

ویسے اگر بڑے تناظر میں دیکھا جائے تو ایسے کسی قدم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔آج اگر امریکا کو’’چپ سازی‘‘ کی صنعت میں سبقت حاصل ہے تو وہ ایسے اقدام سے اپنے حریف کی رفتار کو کم تو کرسکتا ہے لیکن چین کی ترقی کی

باقی صفحہ نمبر ۱۵

امریکا کو غصہ کیوں آتا ہے؟

سولہویں قسط

جنگی جنون کی بھاری قیمت

محمد ابراہیم خان

جنگی جنون کو پروان چڑھانے کے لیے لازم ہے کہ جنگی مشین بھی بڑی ہو۔ انفرادی سطح پر استعمال ہونے والے ہتھیاروں کے علاوہ بم اور میزائل برسانے کے لیے مشینری بھی درکار ہے اور عملہ بھی۔ یعنی محض ہتھیاروں کی تعداد بڑھانا کافی نہیں، تربیت یافتہ فوجیوں کی بڑی تعداد بھی بڑی جنگی مشین کی بنیادی ضرورت ہے۔ امریکا میں جن لوگوں نے جنگی جنون کو پروان چڑھایا ہے، وہ اس بات کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں کہ دفاعی بجٹ میں اضافہ ہو، کیونکہ اسی صورت جنگی مشین کو مضبوط کیا جاسکتا ہے۔ فوجیوں کی بھرتی کا عمل جاری رکھنے اور انہیں بہترین سہولتوں سے ہمکنار رکھنے کے لیے لازم ہے کہ عوام کی جیب پر ڈاکا ڈالا جائے یعنی ان سے وصول کیے جانے والے ٹیکسوں کا بڑا حصہ فوج پر خرچ کردیا جائے۔

امریکا میں ہر سال دفاعی بجٹ کو بہانہ بنا کر مجموعی طور پر ہزاروں ارب ڈالر محکمہ دفاع کے نام کردیے جاتے ہیں۔ فوج کا اپنا بجٹ تو جو ہے سو ہے، کسی بھی ملک پر قبضہ برقرار رکھنے یعنی اُسے ''جمہوریت سکھانے'' کی مد میں بھی ہزاروں ارب ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ افغانستان اور عراق پر قبضہ برقرار رکھنے اور ان دونوں ممالک کی حکومتوں کو امریکی مفادات کے تابع رکھنے پر اب تک تین ہزار ارب ڈالر سے زائد خرچ کیے جاچکے ہیں۔

امریکا میں جنگی جنون پانچ عشروں سے بھی زائد مدت سے پروان چڑھتا آیا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جنوبی کوریا میں امریکی فوجیوں کی تعیناتی کے بعد سے اب تک امریکا نے اپنی جنگی مشین کو برقرار رکھنے اور اہل جہاں کو وقتاً فوقتاً اپنی بھرپور طاقت دکھاتے رہنے پر کم و بیش ۱۵ ہزار ارب ڈالر خرچ کیے ہیں۔ جنگی جنون نے امریکا کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہی دیکھ لینا کافی ہے کہ عوام کی محنت کی کمائی سے وصول کیے ہوئے ٹیکسوں کی مدد سے فوج اور اسلحہ خانے کو جو کچھ دیا جاتا رہا ہے اس کی مالیت ملک کے تمام اثاثوں کی مجموعی مالیت سے بھی زیادہ ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ امریکا میں جتنے پل، سڑکیں، واٹر سسٹم، اسکول، ہسپتال، اسٹڈیم، مکانات، شاپنگ مال، گھریلو آلات، سرکاری مشینری، گاڑیاں اور دوسری بہت سی چیزیں ہیں ان کی مجموعی مالیت بھی اس خطیر رقم سے زیادہ ہے، جو اب تک فوج پر خرچ کی جاچکی ہے۔

امریکا میں تمام جوہری تنصیبات محکمہ توانائی کے کنٹرول میں ہیں۔ ۱۰۰ سے زائد جوہری پلانٹ یہ محکمہ چلا رہا ہے۔ اس مد میں جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے، وہ بھی اس قدر ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر بہبودِ عامہ کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ تمام فوجی تنصیبات، فوجی عملے اور سابق فوجیوں کی بہبود کے کھاتے میں جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے، وہ سالانہ ۸۰ ارب ڈالر سے زائد ہے۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ صرف اس ایک مد میں ایک منٹ میں ۱۰ لاکھ ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ امریکا کے ہر گھر سے سالانہ ۴۴۰۰ ڈالر محض اس لیے وصول کیے جارہے ہیں کہ فوج کو پالا جاسکے۔

جنگی جنون نے عام امریکیوں کو شدید پریشانی سے دوچار کر رکھا ہے۔ بہبودِ عامہ کے منصوبوں کے لیے مختص رقوم میں کٹوتی کی روایت سی پڑ گئی ہے۔ لوگ اپنے لیے سہولتیں تلاش کرتے رہ جاتے ہیں۔ وہ بہت سی بنیادی سہولتوں کے حصول میں اب شدید مشکلات محسوس کرنے لگے ہیں۔ ملک بھر میں پُل، فلائی اوور، سڑکیں، ہسپتال، اسکول اور دیگر عمارات خستگی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ بہت سے پُلوں، سڑکوں اور عمارات میں دراڑیں پڑ چکی ہیں مگر حکومت کے پاس مرمت کے لیے فنڈ نہیں۔ فوج کو دینے کے لیے سرکاری خزانے کے منہ کُھلے رکھے گئے ہیں۔

وفاقی حکومت نے ماس ٹرانزٹ سسٹمز کے لیے فنڈنگ روک دی ہے، جس کے نتیجے میں بڑے شہروں کی حدود میں لوگوں کو بس کے سفر کے لیے اب زیادہ کرایا ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ مہنگائی اور افلاس کے ہاتھوں عذاب سے دوچار افراد کے لیے یہ نیا عذاب ہے۔ اسکولوں کا حال بہت برا ہے۔ بڑے شہروں میں سرکاری سطح کے اسکولوں میں پڑھائی ترک کرکے کام دھندے سے لگ جانے والے بچوں کی تعداد ۸۰ فیصد ہے۔ امریکا بھر میں خواندگی کی شرح گر رہی ہے۔ ۲۰ فیصد سے زائد امریکی کوئی بھی چیز ڈھنگ سے نہیں پڑھ سکتے۔ اور بعض تو ایسے ہیں جو سائن بورڈ پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں۔

امریکا میں تین عشروں کے دوران تعلیم پر خرچ کی جانے والی رقوم میں تشویشناک حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔

طب کا شعبہ بھی غیر معمولی توجہ کا طالب ہے۔ اس وقت امریکا میں ۶ کروڑ سے زائد افراد ایسے ہیں، جنہیں میڈیکل انشورنس کی سہولت میسر نہیں۔ یہ لوگ کسی پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہونے پر ڈھنگ سے علاج کرانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی بھی بیماری طبی عملے کی بھرپور توجہ نہ ملنے پر پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہے اور یوں لاکھوں افراد اپنی ناداری کے ہاتھوں موت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ بہت سے سرکاری ہسپتالوں میں مطلوبہ سہولتیں میسر نہیں۔ فنڈنگ کی کمی کے باعث سرکاری ہسپتالوں میں عام آدمی کا علاج انتہائی دشوار ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں عوام سخت پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

امریکا بھر میں مہنگائی اس قدر بڑھ چکی ہے اور دوسری طرف افلاس کی سطح اتنی بلند ہوئی ہے کہ بہت سے غریب گھرانوں کی متوقع مائیں بہتر نگہداشت حاصل نہیں کر پاتیں۔ بہت سی خواتین زچگی سے قبل اور بعد چونکہ مطلوبہ نگہداشت حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں اس لیے نومولودوں کی شرح اموات بھی خاصی بلند ہے۔ ترقی یافتہ دنیا میں نومولودوں کی شرحِ اموات کے لحاظ سے امریکا سرفہرست ہے۔ یہ شرح اموات جاپان کی شرح اموات سے دگنی ہے۔ امریکا میں ہر پچاسویں منٹ پر ایک بچہ بھوک یا افلاس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ کانگریس دفاعی اخراجات میں اضافے کے حوالے سے تو متحرک رہتی ہے مگر سماجی بہبود اور بالخصوص تعلیم و صحت کی بنیادی سہولتوں کی فراہمی یقینی بنانے کے معاملے میں شرمناک حد تک غفلت اور تساہل کا مظاہرہ کرتی ہے۔

شہروں میں ایک طرف مکانات کے کرائے بڑھتے جارہے ہیں اور دوسری طرف اجرتوں کی سطح گرتی جارہی ہے۔ لاکھوں گھرانے شدید افلاس کے باعث انتہائی پست معیار کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ بُرے حالات نے انہیں ایسا جکڑ رکھا ہے کہ نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ چھوٹے بڑے شہروں میں لاکھوں افراد فٹ پاتھ اور سڑکوں پر آگئے ہیں۔ شدید افلاس کی کوکھ سے جرم پسندی جنم لیتی ہے اور لوگ پست معیار کی زندگی کو اپنا مقدر سمجھ کر اپناتے جاتے ہیں۔ منشیات اور شراب کی لت میں مبتلا ہوکر لاکھوں افراد شرمناک حد تک گرے ہوئے معیار کی زندگی بسر کر

رہے ہیں مگر حکومت متوجہ ہونے کے لیے تیار نہیں۔ منشیات کی لت میں مبتلا افراد کو دوبارہ عمومی زندگی کی طرف لانے کے لیے قائم کیے جانے والے مراکز کا بُرا حال ہے۔ فنڈنگ نہ ہونے کے باعث ایسے مراکز کی کارکردگی خطرناک حد تک غیر متاثر کن ہوچکی ہے۔ لوگ ان کا رخ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور پھر جو تھوڑے بہت مرکز کام کر رہے تھے، ان میں سے بھی کئی ایک بندش کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں۔

امریکا کی جنگی مشین کو متحرک رکھنے کے لیے بہت کچھ درکار ہے۔ اس وقت امریکا کے پاس بارہ طیارہ بردار جہاز ہیں۔ ایک طیارہ بردار جہاز کم و بیش ایک ارب ڈالر کا پڑتا ہے۔ اس رقم سے ۱۷ ہزار مکانات تعمیر کرکے ۶۷ ہزار سے زائد افراد کو بہتر ڈھنگ سے بسایا جاسکتا ہے، سال بھر میں ۱۶ لاکھ خواتین کو زچگی سے قبل کی بہتر نگہداشت فراہم کی جاسکتی ہے، اور اس کے نتیجے میں نومولودوں میں شرح اموات کو نیچے لایا جاسکتا ہے۔ ایک سال میں ۳ لاکھ ۳۴ ہزار بچوں کو اسکول جانے کے قابل بنایا جاسکتا ہے یعنی انہیں اسکول کی سہولت فراہم کی جاسکتا ہے، سال بھر میں ۳ لاکھ ۳۳ ہزار افراد کو منشیات کی لت سے نجات دلانے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے یا ایک سال میں ۵ لاکھ بچوں کو تین وقت کا کھانا فراہم کیا جاسکتا ہے۔

یہ المیہ نہیں تو کیا ہے کہ جنگی جہازوں کو متحرک رکھنے کے لیے تو حکومت کے پاس ہزاروں ارب ڈالر ہیں مگر عوام کو بہتر زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کے لیے فنڈ کی کمی ہے؟

امریکی محکمۂ توانائی کے تحت چلائے جانے والے جوہری پلانٹس سے خارج ہونے والے تابکار مواد سے لاکھوں افراد کی زندگی خطرے میں ہے۔ ان پلانٹس میں کام کرنے والوں کے علاوہ ان کے قرب و جوار میں رہنے والوں میں بھی طرح طرح کی جسمانی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ خطرناک امراض کی دلدل میں دھنستے جاتے ہیں۔ ان پلانٹس سے صحتِ عامہ کو لاحق نقصانات اتنے ہیں کہ حقائق سامنے لائے جائیں تو شدید ہنگامہ برپا ہو مگر حکومت نے سب کچھ رازداری کے پردے میں لپیٹ رکھا ہے۔ رازداری کا بہانہ گھڑ کر افق کو اس قدر دھندلا کر دیا گیا ہے کہ کوئی بھی چیز واضح دکھائی نہیں دے رہی۔

امریکا میں جوہری پلانٹس سے جو تابکار مواد خارج ہوتا رہا ہے، اس نے آس پاس کے پورے ماحول کو انتہائی آلودہ کردیا ہے۔ اس ماحول میں سانس لینا اور وہاں کا پانی پینا بھی انتہائی خطرناک ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ تابکاری کے اثرات ختم کرنے کے لیے ۳۰۰ ارب ڈالر خرچ کرنے ہوں گے۔ اور یہ بل کون ادا کرے گا؟ ظاہر ہے، عوام!

امریکا نے ۶ عشروں کے دوران جوہری تجربات کے ذریعے کم و بیش ۴ لاکھ ۸۰ ہزار فوجیوں کو تابکار مواد کے سامنے کھڑا کیا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کی صحت کے لیے انتہائی پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ ہزاروں امریکی فوجی سرطان میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوئے۔ فوجیوں کو دلاسے دیے گئے کہ حفاظتی انتظامات مکمل اور بے داغ ہیں اور یہ کہ تجربات سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا مگر ایسا نہیں تھا۔ جوہری تجربات کے مقامات پر تعینات فوجیوں کے لیے بھی تابکار مواد خطرناک ہی تھا۔

جوہری تنصیبات پر تعینات فوجی اور دیگر عملے کے علاوہ قرب و جوار میں رہنے والے شہری بھی صحت کے حوالے سے بہت سے مسائل کا شکار رہے ہیں۔ لاکھوں شہریوں کو تابکار مواد کے ہاتھوں کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے شہری بھی سرطان کی زَد میں آئے اور ان کی زندگی بھی داؤ پر لگی۔ جوہری تنصیبات سے خارج ہونے والے پلوٹونیم کے ذرّے عشروں تک متحرک رہتے ہیں۔ ان ذرّات کی زَد میں آنے والوں کی صحت کے زوال پذیر ہونے کا خطرہ برقرار رہتا ہے۔

بہت سے مقامات پر تابکار مواد کو دفن کیا جاتا رہا ہے۔ ان مقامات کو ڈمپنگ گراؤنڈ کہا جاتا ہے۔ تصور یہ کیا جاتا ہے کہ کسی جگہ تابکار مواد کو دفنانے سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا مگر ایسا نہیں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تابکار مواد زمین میں گھلتا جاتا ہے اور پھر پورے ماحول کا حصہ بن کر صحتِ عامہ کے لیے شدید پیچیدگیوں کا باعث بنتا ہے۔ لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہوپاتا اور ان کے پینے کے پانی کے ذخائر میں تابکار مواد شامل ہوتا جاتا ہے۔ ڈمپنگ گراؤنڈز کے قرب و جوار کی فضا اس قدر آلودہ ہوچکی ہوتی ہے کہ اس میں سانس لینا بھی عمومی صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

امریکا بھر میں تابکار مواد اور دیگر فضلے دفنانے کی جگہیں ۱۱ ہزار سے زائد ہیں۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ اگر حکومت ان تمام جگہوں یعنی ڈمپنگ گراؤنڈز کو صاف کرنے پر مائل ہو اور قرب و جوار کے ماحول کو صحت بخش بنانے پر توجہ دے تو تربیت یافتہ افراد کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔ ان تربیت یافتہ افراد کی تنخواہوں، سہولیات، مشینری اور سپلائیز پر کم و بیش ۲۰۰ ارب ڈالر خرچ کرنا پڑیں گے!

نائن الیون کے بعد سے امریکا میں ہوم لینڈ سیکورٹی کا غلغلہ رہا ہے۔ داخلی سلامتی یقینی بنائے رکھنے کے نام پر لوگوں کی جیب ہی خالی نہیں کرائی جارہی بلکہ ان کی آزادی بھی داؤ پر لگادی گئی ہے۔ شہریوں کو میسر آزادیوں پر قدغن لگانے کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر گزرتا ہوا دن عام امریکی کی مشکلات میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ ہوم لینڈ سیکورٹی یعنی اندرون ملک زیادہ سے زیادہ سلامتی یقینی بنانے کے نام پر عام امریکی کا جینا دوبھر کردیا گیا ہے۔ ڈپارٹمنٹ آف ہوم لینڈ سیکورٹی کے سابق سربراہ ٹام رِج کہتے ہیں کہ اگر ہم نے دوسروں کو نشانہ بنانے میں بھرپور دلچسپی اور بے تابی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو دوسرے بھی ہمیں نشانے پر لینے میں اتنی سرگرمی نہ دکھاتے۔ ٹام رِج مزید کہتے ہیں کہ اگر ہم دوسروں پر حملے کرتے رہیں گے تو ہمیں کہیں سے بھی کسی بھی طرح کے حملے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ بات امریکی عوام بھی جانتے ہیں کہ قومی پالیسیوں کے نتیجے میں امریکا سے نفرت کرنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر امریکا کہیں حملہ کرے گا تو ردعمل بھی ہوگا۔ افغانستان اور عراق سے امریکا نے جو سلوک روا رکھا ہے، اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر دہشت گردی کے لیے بھی امریکا کو تیار رہنا چاہیے۔ اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ کیپٹل ہل کے مکین تو جو جی میں آئے وہ کر گزرتے ہیں، بھگتنا عوام کو پڑتا ہے۔ اگر امریکی فوجی کہیں کچھ کرتے ہیں تو جواب میں ان پر حملے کم ہوتے ہیں اور عام، نہتے امریکی کو زیادہ اور آسانی سے نشانہ بنایا جاتا ہے۔ امریکی عسکری مہم جوئی کے اخراجات اور نتائج دونوں ہی عوام کو جھیلنے پڑتے ہیں۔

ڈک چینی جیسے لوگوں نے امریکا کو جنگی جنون کی بند گلی میں پھنسا دیا ہے۔ اب اگر قیادت اس بند گلی سے نکلنا چاہے تو اسے بہت کچھ چھوڑنا اور دوسرا بہت کچھ داؤ پر لگانا پڑے گا۔ امریکی عوام نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بھاری قیمت ادا کی ہے، جنگی جنون کو پروان چڑھانے والوں کے سامنے یہ بات کیجیے تو وہ طنزیہ کہتے ہیں کہ ہم نے کب کہا تھا کہ یہ قیمت ادا نہیں کرنا پڑے گی۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سپر پاور ہونے کی کچھ نہ کچھ تو قیمت ہوتی ہے۔

اپنی سلامتی یقینی بنانے کے نام پر امریکا نے جو کچھ بھی کیا ہے، اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ امریکا میں عام آدمی کی مشکلات اور الجھنوں میں غیر معمولی، بلکہ تشویشناک حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ شہری آزادی داؤ پر

لگ گئی ہے۔ عام امریکی کی زندگی میں سرکاری یا ریاستی مداخلت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ڈھنگ سے جینا آسان نہیں رہا۔ ایسے قوانین نافذ کیے جاچکے ہیں، جن کا مقصد شہریوں کی آزادی کو محدود کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان قوانین کے خلاف آواز اٹھانا بھی آسان نہیں۔ قومی سلامتی کے نام پر شہریوں سے کسی بھی معاملے میں، کسی بھی اقدام پر، کسی بھی قانون کے حوالے سے احتجاج کا حق بھی چھین لیا گیا ہے۔ شہری آزادیوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے گروپوں کو بھی موثر طور پر کام کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ کل تک جو ادارے سیاست دانوں پر نظر رکھتے تھے، وہ اب شہریوں کو بھی مانیٹر کر رہے ہیں۔ قومی سلامتی کو لاحق خطرات کے نام پر کسی بھی شہری کو مقدمہ درج کیے بغیر غیر معینہ مدت تک جیل میں رکھا جاتا ہے۔ پولیس، ایف بی آئی اور سی آئی اے تینوں کو کسی بھی شہری کی عمومی ڈاک اور ای میل پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ کسی بھی وقت گھر میں گھسنے کا حق بھی دے دیا گیا ہے۔

امریکی معاشرے میں دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگ سکونت پذیر ہیں، اور مختلف شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والوں کی کمی نہیں۔ نائن الیون کے بعد داخلی سلامتی یقینی بنانے کے لیے امریکی قیادت نے جو اقدامات کیے، ان کے نتیجے میں مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والے تارکین کے لیے مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ امریکا نے مسلم دنیا میں جو کچھ کیا ہے، اس کے منطقی نتیجے کے طور پر دنیا بھر میں امریکی مفادات کے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ جن مسلم ممالک کو امریکی پالیسیوں نے تباہی سے دوچار کیا ہے، ان سے تعلق رکھنے والے لاکھوں افراد امریکا میں رہتے ہیں۔ ان سے امریکی سلامتی کو لاحق خطرات کا بہانہ گھڑ کر قومی سلامتی کے ادارے زیادہ سے زیادہ امتیازی پالیسیاں اختیار کرتے جارہے ہیں۔ عام امریکی بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلم تارکین وطن سے امتیازی سلوک روا رکھا جارہا ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے میں تقسیم بڑھ رہی ہے۔ جو مسلمان تین چار عشروں سے امریکا میں آباد ہیں، انہیں بھی کسی جواز کے بغیر شک کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ مسلمانوں کی جو نسل امریکا ہی میں جوان ہوئی ہے، وہ بھی مشکوک ٹھہری ہے۔ یہ امتیازی سلوک امریکی معاشرے کے لیے کسی بھی اعتبار سے بہتر علامت نہیں۔ مسلمانوں سے انتہائی پریشان کن سوالات کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہر جواب کو شک کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ بہت سے مسلمانوں کو بلا جواز پابندِ سلاسل کیا گیا ہے۔

امریکی جنگی جنون کی قیمت ویسے تو خیر پورے معاشرے ہی نے ادا کی ہے، مگر سب سے زیادہ خسارے میں وہ فوجی رہے ہیں جنہیں بیرونی محاذوں پر ڈیوٹی دینا پڑی ہے۔ جنوبی کوریا میں فوجیوں کی تعیناتی سے اب تک امریکا کے ایک لاکھ سے زائد فوجی بیرونی مہمات میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ لاکھوں امریکی فوجی زخمی ہوئے ہیں اور ان میں سے بہت سے زندگی بھر کے لیے اپاہج بھی ہوچکے ہیں۔ خلیج کی پہلی جنگ کے بعد ہزاروں امریکی پراسرار بیماری میں مبتلا پائے گئے۔ اس بیماری کو گلف وار سنڈروم کہا جاتا ہے۔ گلف وار سنڈروم میں مبتلا ہونے والوں کے لیے معمول کی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہا۔

ہزاروں امریکی فوجی جنگ کی ہولناکیوں کے ہاتھوں نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوکر بہت بُری اور تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ویت نام کی جنگ میں لاکھوں امریکی فوجیوں نے حصہ لیا۔ ان میں سے بہت سوں کو عجیب و غریب نفسیاتی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے امریکی فوجیوں نے بعد میں ذہنی الجھن سے نجات پانے کے لیے خودکشی کرلی۔ ویت نام میں سَفّا کی اور درندگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو بعد میں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا، جو ان کے لیے سوہانِ روح ہوگئے۔ معصوم اور نہتے انسانوں بالخصوص خواتین اور بچوں کو نشانہ بنانے پر امریکی فوجی بعد میں احساسِ جرم سے ایسے پریشان ہوئے کہ ان کے لیے معمول کی زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہا۔ بہت سے امریکی فوجی پاگل ہوئے اور دوسرے بہت سے فوجیوں نے ضمیر کے خنجر سے لگنے والے واسہنے پر موت کو ترجیح دی۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ ہزاروں امریکی فوجی ریٹائرمنٹ کے بعد ایسی ذہنی الجھنوں کا شکار ہوئے کہ اُن کا آخری وقت سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزرا۔ معاشرہ ذہنی پیچیدگیوں کے ساتھ انہیں قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

خودکشی کا رجحان صرف ریٹائرڈ امریکی فوجیوں میں نہیں پایا جاتا۔ بہت سے حاضر سروس فوجی بھی بیرون ملک اور بالخصوص وارزون میں ڈیوٹی دیتے وقت جن سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں بعد میں شدید ذہنی الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔ اور یہ ذہنی الجھنیں انہیں موت کی طرف لے جاتی ہیں۔ امریکا اور عراق میں ڈیوٹی کے دوران جن امریکی فوجیوں کو شہریوں پر اندھا دھند فائرنگ، گولا باری یا بمباری کا حکم دیا گیا وہ بعد میں اپنے کیے پر ایسے نادم ہوئے کہ مزید زندہ رہنے پر موت کو گلے لگانا ان کے لیے زیادہ قابلِ ترجیح ٹھہرا۔

کوئی بھی شخص پیدائشی طور پر لڑائی بھڑائی کو پسند نہیں کرتا۔ امریکا میں جنگی جنون پروان چڑھانے والے بھی اس نکتے کو اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے وہ معاشرے میں ہر طرف ایسی چیزیں عام کرتے ہیں جن سے بچوں کو چھوٹی عمر ہی سے اندازہ ہوجائے کہ اس دنیا میں اگر ڈھنگ کا کوئی کام ہے تو وہ ہے لڑنا بھڑنا۔ ٹی وی چینلوں پر، وڈیو میں اور سوشل میڈیا پر بھی ایسے رجحانات عام کیے جاتے ہیں، جو لڑائی بھڑائی پر مشتمل ہوں۔ فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں تشدد آمیز مناظر شامل کیے جاتے ہیں تاکہ بچے لڑنے بھڑنے کو زندگی کا جُز سمجھنے لگیں۔ بازار میں ایسے کھلونوں کی بھرمار ہے، جنہیں استعمال کرنے سے بچوں میں جنگ پسندی کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔

اسکولوں اور کالجوں کی سلامتی یقینی بنانے کے لیے سابق فوجیوں کو گارڈ کی حیثیت سے ملازمت دی جاتی ہے۔ یہ ریٹائرڈ فوجی نئی نسل کے ذہنوں میں فوج کو پسند کرنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ پھر یہی فوجی نئی نسل کو فوج میں بھرتی ہونے کی تحریک دیتے ہیں۔ انہیں باور کرایا جاتا ہے کہ فوج میں جانے سے ان کے لیے مزے ہی مزے ہوں گے۔ نئی نسل بہتر مستقبل کی تلاش میں فوج کا رخ کرتی ہے اور کچھ ہی عرصے کے بعد حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ پھر جب وہ فوج سے نکل بھاگنے کا سوچتے ہیں تو انہیں ڈرا دھمکا کر روکا جاتا ہے۔

امریکا میں بعض کمیونٹیز میں بڑھتی ہوئی غربت نے نوجوانوں کو فوج کی طرف دھکیلا ہے۔ افریقی اور میکسیکن نسل کے امریکیوں کے علاوہ ریڈ انڈینز میں بھی غربت زیادہ پائی جاتی ہے، اس لیے وہ فوج کا رخ کرتے ہیں۔ امریکا میں افریقی نسل کے سیاہ فام باشندے ۱۲ فیصد سے زائد نہیں مگر ویت نام کی جنگ میں مارے جانے والے امریکی فوجیوں میں ۲۲ فیصد سیاہ فام تھے۔

سب سے بڑی ناانصافی یہ ہے کہ جنگ شروع کوئی کرتا ہے، اور اس کا خمیازہ کسی اور کو بھگتنا پڑتا ہے۔ جنگی جنون میں مبتلا جو شخصیات جنگ کی باتیں کرتی ہیں، ان کا جنگ سے عملی تعلق صفر کے مساوی ہوتا ہے۔ وہ جنگ چھڑتے ہی الگ ہوجاتے ہیں اور سب کچھ انہیں برداشت کرنا پڑتا ہے، جن کا اس پورے عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ چار پانچ عشروں سے ہو رہا ہے مگر سلسلہ کہیں رکتا دکھائی نہیں دیتا۔

|||

دو جان یک قالب

صدیق سالک

پاکستان میں دوسرے ملک گیر مارشل لاء کی پہلی سالگرہ تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرنے صوبے کے اندرونی علاقے میں جا رہے تھے۔ اُن کی کھڑکھڑاتی کار کی پچھلی نشست پر ان کے ساتھ ایک بنگالی صحافی بیٹھا تھا، جو شیخ صاحب کی انتخابی مہم کی خبریں اپنے اخبار کو بھیجتا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں انہیں کسی نازک سیاسی مسئلے پر چھیڑا اور چپکے سے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ بعد میں وہ یہ ٹیپ سنا کر دوستوں کی تواضع کیا کرتا تھا۔ اس نے یہ ٹیپ مجھے بھی سنایا۔ مجیب کی جانی پہچانی اور گرجدار آواز صاف سنائی دے رہی تھی:

''ایوب خاں نے مجھے مقبولیت کی ایسی معراج پر پہنچا دیا ہے کہ اب کوئی شخص میری مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا..... کوئی شخص مجھے ''ناں'' نہیں کہہ سکتا۔ حتیٰ کہ یحییٰ خاں بھی میرے مطالبات کو رَد نہیں کر سکتا''۔

مجیب کے مطالبات اور عزائم کیا تھے؟ اس کی نشاندہی ایک اور ٹیپ سے ہوتی ہے، جو یحییٰ خاں کے محکمہ سراغ رسانی نے چوری چھپے تیار کیا تھا۔ اس میں مجیب کی آواز بند تھی۔ موضوع تھا، ایل ایف او (Legal Frame WorkOrder) یہ قانونی ڈھانچا عملاً ایک دستوری خاکہ تھا جس میں قومی سلامتی کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس کی وہ شقیں جو ''چھ نکات'' کی راہ میں حائل ہوتی تھیں، مجیب کو سخت ناپسند تھیں۔ اس دستوری خاکے کے متعلق مجیب نے انجانے میں اپنے قریبی حلقوں میں حسب ذیل رائے کا اظہار کیا تھا، ''میرا مقصد بنگلا دیش کا قیام ہے، انتخابات ختم ہوتے ہی مَیں ایل ایف او کو پُرزے پُرزے کر دوں گا، کون ہے جو انتخابات کے بعد میرے سامنے ٹِک سکے''۔

جب یحییٰ خاں نے یہ الفاظ سنے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا فوری ردِعمل تھا:

''اگر اس نے مجھے دھوکا دیا، تو میں اس کو سیدھا کر دوں گا''۔

مجیب اور یحییٰ کے یہ خیالات بعد کی باتیں ہیں، ان کا صحیح پس منظر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بات جنوری ۱۹۷۰ء سے شروع کی جائے جب میں پہلی بار دو سال کے لیے ڈھاکا گیا۔

میں جب راولپنڈی سے ڈھاکا روانہ ہوا تو رخت سفر بڑا مختصر تھا، مگر میرے ذہن میں خیالات کا وزن بہت بھاری تھا۔ یہ خیالات ملکی سالمیت سے متعلق تھے، مگر اس وقت مجھے اس سلسلے میں ہندوستان کی امکانی جارحیت کی بجائے اندرونی سیاست کے مدوجزر کا زیادہ احساس تھا، کیونکہ مغربی پاکستان میں جہاں مَیں نے بیس پچیس سال گزارے تھے، یہ تاثر عام تھا کہ مجیب کے ''چھ نکات'' علیحدگی کی در پردہ اسکیم کا دوسرا نام ہے اور بعض حلقوں میں یہ بات بھی اکثر سننے میں آئی تھی کہ ۱۹۶۸ء کی اگرتلہ سازش بھی اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے عملی اقدام تھا۔ ان باتوں میں کہاں تک صداقت تھی اور کہاں تک تعصب، اس کا مجھے علم نہ تھا، میں نے سوچا کہ بنگالی بھائیوں سے براہ راست ملوں گا تو صورتحال خود بخود واضح ہو جائے گی۔

اُن دنوں مشرقی پاکستان میں ۲۵ ہزار کے لگ بھگ فوجی تعینات تھے۔ میں سرکاری فرائض کے سلسلے میں انہی میں شامل ہونے جا رہا تھا، مگر ۱۸۰۰ کلومیٹر پر پھیلے ہوئے وسیع ہندوستانی علاقے کے اوپر پرواز کرتے ہوئے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر ہندوستان نے ہم پر حملہ کر دیا، تو کیا یہ ۲۵ ہزار فوجی موثر طور پر مشرقی پاکستان کا دفاع کر سکیں گے؟

میں ایک ''سچے'' پاکستانی کی طرح ان خیالوں سے آنکھیں بچانے کے لیے ماضی کی ان بوسیدہ دلیلوں میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔ ''آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکا ہی میں تو رکھی گئی تھی.....''۔

''قرارداد پاکستان جو ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منظور ہوئی، ایک بنگالی لیڈر ہی نے تو پیش کی تھی''..... پھر ڈر کاہے کا؟

انہی خیالات کے جھرمٹ میں مَیں تیج گاؤں (ڈھاکا) ایئرپورٹ پر اترا۔ زمین پر سبزے کے قالین بچھے تھے اور آسمان پر نقرئی بادل مسکرا رہے تھے۔ بدلیاں تو بہت تھیں مگر بکھری بکھری۔ ان کی اوٹ اتنی گھنی اور گہری نہ تھی کہ ہنستے ہوئے سورج کا چہرہ مکمل طور پر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا..... فضا معتدل اور ماحول سکون آمیز سا!

میرے ساتھ اسی جہاز سے بعض فوجی افسر اُترے جو مارشل لاء ڈیوٹی سے متعلق تھے۔ وہ کسی اور ہی ہوا میں تھے، درّاتے ہوئے وی آئی پی لاؤنج میں گئے اور گہرے اور دبیز صوفوں میں سستانے لگے۔ باہر بنگالی قلی ہانپتے کانپتے اُن کا سامان گورنمنٹ ہاؤس کی نقرئی پلیٹوں والی گاڑیوں میں لادنے لگے۔ آناً فاناً وہ باہر نکلے اور گاڑیوں میں بیٹھ کر ہوائی اڈے سے نکل گئے۔

میں دوسرے برآمدے میں کھڑا کسی مناسب سواری کا انتظار کرنے لگا (راستے میں جہاز کی خرابی کی وجہ سے میں نے فلائٹ بدل لی تھی، مگر اس کی اطلاع ڈھاکا نہ پہنچا سکا) تھوڑی دیر بعد ایک فوجی جیپ میرے قریب آ کر رکی۔ حوالدار نے مجھے اسمارٹ سا سلیوٹ کیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک بنگالی لڑکے کو بھبک دار لہجے میں حکم دیا: ''صاحب کا اٹیچی کیس جیپ میں رکھو''۔

سہمے ہوئے لڑکے کو یہ بھبک ناگوار تو گزری، مگر اپنے ''آقا'' پر ایک احتجاجی نگاہ ڈالتے ہوئے حکم بجا لایا۔ اُس نے گھور کر میری طرف بھی دیکھا۔ اس کے سیاہ چہرے کے چوکھٹے میں سفید سفید آنکھیں وحشت کا احساس لیے ہوئے تھیں۔ مَیں نے اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور چند سکّے اس غریب لڑکے کو دینا چاہے، مگر حوالدار نے پُرزور لہجے میں کہا، ''سر! ان حرام زادوں کی عادت نہ بگاڑیے''۔ میں نے مشورہ مان لیا..... اور بنگالی لڑکا ایک بار پھر نفرت بھری نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

ایئرپورٹ کی بلند و بالا عمارت پر پرچم ستارہ و ہلال پوری آب و تاب سے لہرا رہا تھا۔

مَیں چھاؤنی روانہ ہو گیا۔

جو دوست مجھے ایئرپورٹ لینے نہ پہنچ سکے تھے، شام کو آفیسر میس میں آئے۔ بڑے تپاک سے ملے، اپنی غیر حاضری کی معافی مانگنے لگے۔ رسمی گفتگو کے بعد مشرقی پاکستان کی صورتحال زیر بحث آئی تو انہوں نے اس ''غیر مناسب'' موقع پر جبکہ حالات دگرگوں ہو رہے ہیں، مشرقی پاکستان میں میری تقرری پر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ پند و نصائح سے بھی نوازا۔ نمونے کے چند موتی حاضر ہیں:

''یہاں عملی طور پر مارشل لاء کا کوئی وجود نہیں ہے''۔

''گھرداری کے لیے ہرگز بھاری بھاری چیزیں نہ خریدنا، کیا معلوم کب اور کن حالات میں یہاں سے بوریا بستر گول کرنا پڑے''۔

''اپنا روپیہ پیسہ شہر کے کمرشل بینک کے بجائے چھاؤنی کے نیشنل بینک میں رکھوانا''۔

''اور ہاں! اپنے پیش رو کے فلیٹ ہی میں ٹکے رہنا، یہ

صندوق نما فلیٹ بڑا محفوظ ہے۔ اس میں کوئی شر پسند آسانی سے بم نہیں لڑھکا سکتا''۔

میرے خیال میں یہ سب وہم تھے، ورنہ کسی بنگالی کو کیا پڑی ہے کہ میرے گھر میں بم پھینکے۔ صورت حال خراب سہی، مگر اتنی تو نہیں کہ شعلے اچانک بھڑک اٹھیں۔

مَیں نے دوستوں کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے ''کمک'' یعنی بیوی بچوں کو بلوانے کے لیے تار بھیج دیا۔ چند روز میں وہ پہنچ گئے، تو انہیں اپنے مورچہ نما فلیٹ میں متعین کر دیا۔ بچوں کے آتے ہی اگلے روز بنگالیوں کا ایک ہجوم ہمارے گھر پر ٹوٹ پڑا، مگر وہ شر پسند نہ تھے محض محنت مزدوری کرنے والی عورتیں تھیں جو ''آیا'' کے طور پر ملازمت کرنے کی خواہش مند تھیں۔ بنگالی عورتیں مغربی پاکستانیوں کے گھروں میں ملازمت کو ترجیح دیتی تھیں جیسے تقسیم ہند سے پہلے ہندوستانی خانسامے اور بیرے کسی انگریز کے ہاں نوکری کو بہتر سمجھتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ میری بیوی نے دو نوکرانیاں ملازم رکھ لی ہیں۔ بظاہر یہ سراسر فضول خرچی تھی، مگر جب بیوی سے جواب طلبی کی تو وہ کہنے لگی: ''فکر نہ کیجیے ان دونوں کی تنخواہ ہمارے راولپنڈی والے واحد ملازم کی تنخواہ سے کم ہوگی''۔ میں نے فکر کرنا چھوڑ دیا۔

گھر آباد کرنے کے لیے برتنوں کی ضرورت پڑی، تو میں ڈھاکا سے ۱۴ کلومیٹر دور ٹونگی میں پاکستان سرامک انڈسٹریز گیا۔ راستے میں افلاس اور ناداری کے ایسے ایسے دردناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ ملازمت کے لیے ماری ماری پھرتی ''آیاؤں'' کی بے چینی سمجھ میں آ گئی۔ راستے میں جو عورتیں نظر آئیں ان کے پاس ستر پوشی کے لیے چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو مرد دکھائی دیے وہ عموماً کوتاہ قامت اور فاقہ زدہ تھے۔ ان کی سیاہ جلد میں منڈھی ہوئی پسلیاں چلتی گاڑی سے بھی گنی جا سکتی تھیں۔ بچوں کی حالت بڑوں سے بدتر تھی، ان کی ہڈیاں کمزور اور جسم نحیف تھے۔ کمزور ٹانگوں کے اوپر ابھری ہوئی توندیں باہر کو اُمڈ رہی تھیں۔ بعض بچوں کی کمر کے گرد گندا سا دھاگا بندھا تھا جس سے ایک گھنٹی لٹک رہی تھی، یہ اُن کا واحد کھلونا تھا۔

راستے میں جہاں جہاں رکا بھک منگوں کے غول کے غول مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام غریب آدمی مغربی پاکستان کے انتہائی غریب آدمی سے بھی غریب تر ہے۔ مجھے مشرقی پاکستان کی معاشی بدحالی کے بارے میں سنی ہوئی باتوں میں وزن نظر آنے لگا..... مَیں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا۔

مجھے خیال ہونے لگا کہ چند روز پہلے میرے دوست شاید ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، کیونکہ اگر یہ بھوکے ننگے لوگ انبوہ در انبوہ مشتعل ہو جائیں تو واقعی بازار لوٹ سکتے ہیں، چھاؤنی پر ہلّہ بول سکتے ہیں..... اور میرے گھر میں بم بھی پھینک سکتے ہیں۔

فیکٹری کے دروازے پر ایک لمبا تڑنگا آدمی ملا، وہ کوٹ پتلون پہنے تھا اور وضع قطع سے پنجابی لگتا تھا۔ اس نے بھی میرے خدوخال سے میرے علاقائی تعلق کا اندازہ لگایا۔ وہ مسٹر نیازی تھا، جو فیکٹری میں سیکورٹی اسسٹنٹ کا کام کرتا تھا۔ بڑے تپاک اور محرمانہ انداز میں باتیں کرنے لگا۔ جب میں نے وہاں آنے کا مقصد بتایا تو کہنے لگا: ''میری مانیے تو برتنوں کا آرڈر خود نہ دیجیے، یہاں کے بنگالی مزدور مغربی پاکستان کے افسروں سے کدر کھتے ہیں۔ ان کے آرڈر کے برتن بھی جان بوجھ کر خراب کر دیتے ہیں، آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجیے''.....

ڈھاکا واپس پہنچ کر میں نے دن بھر کے تجربات ایک پرانے پنجابی دوست سے بیان کیے۔ خاص طور پر غربت کے دردناک مناظر کا ذکر بڑے پُر اثر انداز میں کیا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، بلکہ اُلٹا بنگالیوں کو ان کی کاہلی اور نااہلی کے لیے کوسنے لگا۔ اس نے نفرت آمیز انداز میں کہا ''یہ صرف ایک کام میں طاق ہیں..... اور وہ ہے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کی بے دریغ خلاف ورزی!..... آپ ان کی غربت کا اتنا اثر نہ لیں، میں آپ کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کسی دن شہر (ڈھاکا) لے چلوں گا''۔

کیپٹن چوہدری واقعی اپنی پہلی فرصت میں مجھے گاڑی پر بٹھا کر شہر لے گیا۔ پہلے ہم شہر کے شاندار علاقوں میں گھومتے رہے جن میں اسٹیٹ بینک، گورنمنٹ ہاؤس، ہائی کورٹ، انجینئرز انسٹی ٹیوٹ، ریلوے اسٹیشن، یونیورسٹی کیمپس، بیت المکرّم، اسٹیڈیم، نیو مارکیٹ اور ایسی ہی بارعب عمارتیں شامل تھیں..... ان عمارتوں کا چکر لگانے کے بعد کیپٹن صاحب نے اہانت آمیز لہجے میں کہا ''پہلے یہاں کچھ بھی نہیں تھا، یہ سب کچھ ۱۹۴۷ء کے بعد بنا..... اور وہ بھی سالانہ سیلابوں، سمندری طوفانوں اور قیامت خیز سائیکلونوں کے باوجود! ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص زرمبادلہ کے آمد و خرچ کے اعداد و شمار جمع کرے اور مجیب کی طرف سے عائد کردہ اقتصادی استحصال کے الزامات کی قلعی کھول دے''۔

میں کیپٹن چوہدری کی باتیں سن کر سوچنے لگا کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہے اور حقائق مجیب کے خلاف ہیں، تو پھر ڈرکس بات کا؟ اس کے علاوہ مجیب کا توڑ مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی تو ہیں جو ایک بااثر اور متوازی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں..... اور ہاں! دائیں بازو کی کئی جماعتیں بھی تو مجیب کے خلاف ہیں جو اکثر و بیشتر ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اسلامی رشتے پر زور دیتی رہتی ہیں۔ بھلا ان حالات میں مجیب کس طرح من مانی کر سکتا ہے۔ اگر اس کا سب سے بڑا ہتھیار رائے عامہ ہے، تو اس کا اندازہ تو انتخابات کے بعد ہی ہوگا۔ دیکھیے انتخابات میں کیا ہوتا ہے۔

انتخابات کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر سے یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے پابندی اٹھا لی گئی، سال نو کا خیر مقدم بائیں بازو کے طلبہ کی جماعت نے آدھی رات کو مشعل بردار جلوس نکال کر کیا، جس میں انہوں نے ''سرخ انقلاب'' کے نعرے لگائے۔ ان کی حریف جماعت ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ نے (جس کا الحاق عوامی لیگ سے تھا) اگلے روز ایک جلسہ عام میں یہ اعلان کیا کہ ''ہماری نجات کا راز'' چھ نکات میں ہے..... صرف چھ نکات میں.....'' دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طالب علموں نے اپنا کوئی زور نہ دکھایا۔

سیاسی جماعتوں میں عوامی لیگ، جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) بہت سرگرم تھیں۔ عوامی لیگ نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز ۱۱ جنوری کو پلٹن میدان میں ایک عظیم الشان جلسے سے کیا۔ یہ جلسہ تنظیم اور تعداد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ اخباری اصطلاح میں وہاں لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ تعداد کے علاوہ گفتار و افکار کے لحاظ سے بھی یہ اجتماع یادگار تھا۔ اس سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ بنگالیوں نے ۱۹۵۶ء کے دستور میں برابری (Parity) کے اصول کو تسلیم کر کے سخت غلطی کی تھی۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر ''بنگلا دیش'' پر یہ اصول دوبارہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو اس کی مزاحمت کی جائے گی اور عوام کے حقوق کے لیے تحریک چلائی جائے گی۔

بعد میں بنگال کے ممتاز سیاست دان مرحوم تفضّل حسین عرف مانک میاں (روزنامہ اتفاق کے مالک، جن کا انتقال ۳۰ مئی ۱۹۶۹ء کو ہوا) کے سپوت بیرسٹر معین الحسین نے مجھ سے کہا ''میرے والد کی زندگی میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو بنگالیوں کے لیے قابل قبول بنانا ممکن تھا، مگر اب گاڑی چھوٹ چکی ہے''۔ میں نے اس دعوے کی تصدیق بعض بزرگ سیاستدانوں سے چاہی تو انہوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا ''جی ہاں، حسین شہید سہروردی کی موت کے بعد اگر کسی کا اثر و رسوخ مجیب پر تھا تو وہ مانک میاں ہی تھے''۔

ایک ہفتے بعد جماعت اسلامی نے اسی پلٹن میدان میں

اپنا جلسہ منعقد کیا جہاں عوامی تحریک نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ جماعت اسلامی نے بھی اپنے اجتماع کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی، مگر یہ جلسہ ہلڑ بازی کا شکار ہوگیا۔ نوبت مارکٹائی تک پہنچی جس میں دو آدمی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں سے پچیس کی حالت تشویشناک تھی۔ امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو جلسے سے خطاب کرنے خاص طور پر لاہور سے ڈھاکا پہنچے تھے تقریر کیے بغیر جلسہ گاہ سے واپس آگئے۔

اس خونریز جھڑپ میں جماعت اسلامی ایک مظلوم اور ستم رسیدہ جماعت بن کر نکلی۔ جماعت نے خون خرابے کی ذمہ داری عوامی لیگ پر ڈالی کیونکہ جلسہ گاہ کے ایک حصے سے ''جوائے بنگلا'' (بنگلا دیش زندہ باد) کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ عوامی لیگ یہ کہہ کر اس الزام کی بھرپور تردید کرتی تھی کہ تشدد اس کے مفاد میں نہیں، کیونکہ اس سے انتخابات التوا کا شکار ہو سکتے تھے۔

فریقین میں یہ بحث اپنی جگہ بجا، مگر سوال یہ ہے کہ اس گڑبڑ کو روکنے کے لیے انتظامیہ نے کیا کیا۔ خونریز جھڑپوں کے دوران پولیس کہاں تھی، اس نے بروقت اور موثر مداخلت کر کے امن وامان بحال کیوں نہ کیا؟ میں نے یہ سوال مارشل لاء انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر کے سامنے اٹھائے، تو اس نے کہا ''حکومت نے جماعت اسلامی کو ضروری تحفظ کی پیشکش کی تھی، مگر جماعت نے اسے یہ کہہ کر رَد کر دیا کہ ہمارے پاس انتظام ہے''۔ اس سے انتظامیہ یہ سمجھی کہ غالباً جماعت یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ ''اگر عوامی لیگ اپنے بل بُوتے پر اتنا شاندار جلسہ کر سکتی ہے تو ہم بھی کسی سے کم نہیں، کیونکہ حکومت کی پناہ تو ہمیشہ کمزور جماعتیں ہی ڈھونڈتی ہیں''۔ میں نے جب یہ بات جماعت کے ایک ہمدرد سے کہی تو اس نے جواب دیا ''نہیں، یہ سراسر جھوٹ ہے، جماعت نے کوئی پیشکش نہیں ٹھکرائی۔ درحقیقت حکومت اپنی غیر جانبداری قائم رکھنے کے لیے سربام بیٹھی تماشا دیکھتی رہی''۔

جنوری ۱۹۷۰ء کا تیسرا اہم سیاسی واقعہ سنتوش میں ''کسانوں کی ریلی'' تھی، جس کا اہتمام مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے کیا تھا۔ اس میں شرکت کے دعوت نامے ان تمام پارٹیوں کو دیے گئے، جو سوشلزم پر اعتقاد رکھتی تھیں۔ حکومت نے اس ''ریلی'' کو کامیاب بنانے کے لیے خصوصی گاڑیاں چلائیں اور جلسہ گاہ تک بجلی پہنچانے کے انتظامات کیے، کیونکہ گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھنے والے بعض سیاسی پنڈتوں کا خیال تھا کہ مجیب الرحمٰن کا اثر زائل کرنے کے لیے نیپ (بھاشانی) کو کامیاب اور فعال بنانا ضروری ہے۔

اس کے باوجود ''ریلی'' ناکام ہوگئی۔ ناکامی کی وجہ کسی حریف جماعت کی دخل اندازی کی بجائے اس کا اپنا اندرونی خلفشار تھا..... کئی دنوں کے شور شرابے کے بعد اگر اس تقریب سے کچھ برآمد ہوا تو چند نعرے تھے:

خون اور آگ..... آگ!! آگ!! آگ!!

پرچی یا گولی..... گولی! گولی! گولی!!!

نیپ (بھاشانی) کا انتہا پسند گروپ جس کی قیادت پارٹی کے سیکرٹری جنرل مسٹر طٰہٰ کے ہاتھوں میں تھی، سرے سے انتخابات پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انتخابات سے حکومت تو بدل سکتی ہے، مگر سماجی و اقتصادی تبدیلی نہیں آسکتی۔ جس کا واحد ذریعہ ''سرخ انقلاب'' ہے۔

ایک شام ایک اخبار کے دفتر میں میری ملاقات مسٹر طٰہٰ سے ہوگئی، وہ نیپ (بھاشانی) سے تازہ تازہ الگ ہوئے تھے۔ اپنی علیحدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا ''میں نے پہلے عوامی لیگ کو اس لیے چھوڑا تھا کہ اس میں کوئی انقلابی شعبہ باقی نہیں رہا تھا، چنانچہ میں نے انقلابی نصب العین حاصل کرنے کے لیے نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی، مگر اب یہ پارٹی بھی اپنے نصب العین سے بھٹک گئی ہے، اب اس میں بھی عوامی لیگ کی طرح کوئی چنگاری باقی نہیں رہی..... میں اپنا آئندہ کا لائحہ عمل انتخابات کے بعد وضع کروں گا''۔

ان تین سیاسی جماعتوں کے علاوہ چند اور سیاسی جماعتیں اور گروہ بھی تھے جن میں کرشک سرامک پارٹی، پاکستان نیشنل لیگ، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت العلمائے پاکستان اور مسلم لیگ (تین گروہ) شامل ہیں۔ یہ سب سیاسی اکھاڑے میں اترے، مگر افتاں وخیزاں..... ان میں سے کسی نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ دیا جس سے سیاسی ہلچل مچ سکتی، البتہ ان نسبتاً چھوٹی جماعتوں میں پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر جناب محمد نورالامین کا ذکر ضروری ہے کیونکہ انتہا پسندی کے اس جذباتی ماحول میں انہوں نے اعتدال، رواداری اور انصاف کی آواز بلند کی یہ بہت بڑی بات تھی، کیونکہ تاریک آندھی میں چراغ جلانا بے شک نتائج کے لحاظ سے بے سود ہو، مگر جذبے اور نیت کے اعتبار سے قابل ستائش۔

مسٹر نورالامین کی یہ آواز بے اثر ثابت ہوئی، کیونکہ ماحول بدل چکا تھا۔ قدریں روندی جا رہی تھیں، قومی سالمیت کے منافی نعرہ بازی روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ اس آندھی کو روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ حکومت کی گدی پر بیٹھنے والے اس آندھی سے بے خبر تھے یا دیدہ دانستہ اسے نظر انداز کر رہے تھے۔

سیاسی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد میں اقتصادیات کے وڈیروں اور بنگال کے دانش وروں کی طرف متوجہ ہوا، کیونکہ میرے خیال میں یہ دو طبقے کسی ملک کی سیاسی تقدیر بدلنے میں خاموش مگر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تجارتی حلقوں میں مسٹر رحمٰن، مسز احمد، مسٹر بھوئیاں اور چند دوسرے حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کا زورِ بیاں اس بات پر ٹوٹتا تھا کہ جناب مغربی پاکستان میں جتنی ترقی ہوئی ہے، مشرقی پاکستان کے پیسے سے ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ عوامی لیگ کی زیر سرپرستی چھپنے والے لٹریچر کا اکثر حوالہ دیتے جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان کی مجموعی آمدنی کا ۶۰ فیصد حصہ مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتا ہے، مگر اس پر قومی آمدنی کا صرف ۲۰ فیصد خرچ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان قومی آمدنی کا صرف چالیس فیصد کماتا ہے، مگر کل آمدنی کا ۷۵ فیصد کھا جاتا ہے۔

اعداد وشمار کے علاوہ یہ حضرات بعض عملی دشواریوں کا بھی اکثر ذکر کرتے اور روزمرہ زندگی سے ایسی مثالیں دیتے کہ سارا تجارتی نظام مضحکہ خیز نظر آتا۔ مثلاً وہ کہتے کہ ایک جہاز جو مشرق وسطیٰ سے ربڑ وغیرہ لے کر چٹاگانگ روانہ ہوتا ہے پہلے سیدھا کراچی جاتا ہے۔ پھر کراچی سے چٹاگانگ آتا ہے جس سے کرایہ بھی بڑھتا ہے اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے، اسی طرح فوج کے استعمال میں آنے والی چھل جالیاں (Camouflage Nets) عموماً پٹ سن سے بنتی ہیں، پٹ سن کی فیکٹریاں یہاں ہیں مگر پہلے یہ تیار شدہ مال رنگائی کے بہانے مغربی پاکستان بھیجا جاتا ہے اور پھر واپس منگوا کر یہاں کے یونٹوں کو دیا جاتا ہے..... معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس وقت تک مشرقی پاکستان کے لیے مناسب نہیں سمجھی جاتی جب تک اس پر مغربی پاکستان کی قبولیت کی مہر ثبت نہ ہو جائے۔ خواہ یہ تجارتی مال ہو، سیاست دان ہوں یا انتظامیہ کے افسر.....

ذہنی اور فکری محاذ پر بھی کیفیت تشویشناک تھی۔ چند ذاتی تجربے پیش کرتا ہوں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں جس شخص سے سب سے پہلے رابطہ قائم ہوا، وہ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کی ڈھاکا شاخ کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر تھے۔ وہ میری خواہش پر مجھے سینٹر کی لائبریری دکھانے لگے۔ چلتے چلتے ''آرٹ سیکشن'' کے سامنے رُک گئے۔ شیلف سے اعلیٰ طباعت والی خوبصورت کتاب نکالی اور بنگالی لہجے اور نفرت سے کہنے لگے ''ذرا ملاحظہ ہو راولپنڈی سے ہمارا ہیڈ آفس

ہمیں کیا بھیج رہا ہے؟ یہ قومی دولت کا سراسر ضیاع نہیں تو کیا ہے؟ کیا آپ نے کسی بنگالی شاعر کے بارے میں ابھی اس پائے کی کوئی کتاب شائع کی ہے؟'' اُن کی برہمی کا باعث ''مرقع چغتائی'' تھا، جس میں یکتائے روزگار شاعر اسد اللہ خاں غالبؔ کے منتخب اشعار کی مصور ترجمانی کی گئی تھی۔

لائبریری کے اس چکر میں وہ ایک جگہ اور رکے اور شیلف کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا: ''یہ سارا شیلف تمہارے قائداعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے''۔ زور ''تمہارے'' پر تھا، جس کی چبھن مجھے محسوس ہوئی اور میں ٹیس کو دل میں سمیٹ کر واپس چلا آیا۔

چند روز بعد مجھے فلم سنسر بورڈ ڈھاکا کی میٹنگ میں ایک اور یادگار تجربہ ہوا۔ یہ میٹنگ بلانے کا مقصد چربہ فلموں کی روک تھام تھا، جن کا اکثر مواد فلموں اور ناولوں کی شکل میں کلکتہ سے آتا۔ اس اجلاس میں ڈھاکا کی فلمی صنعت کے تمام نمائندے یعنی پروڈیوسر، ڈائریکٹر، فنکار اور قلمکار موجود تھے۔ صدر مجلس نے ابتدائی کلمات میں قومی وقار اور اخلاقی اقدار کے نام پر ''سرقہ'' اور ''چربہ'' کی لعنت ختم کرنے پر زور دیا اور تمام حاضرین سے تعاون کی اپیل کی۔ اس پر فلمی صنعت کے بااثر ڈائریکٹر جو خود اچھے قلمکار بھی تھے، اپنے ساتھیوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے فرمایا ''پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں ایک اعلیٰ سطحی مذاکرہ پہلے بھی یہاں منعقد ہوا تھا، جس میں یہاں کی فلمی صنعت کے مفاد میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت اس کی نشوونما کے روایتی سرچشموں میں مداخلت نہیں کرے گی۔ میں مارشل لاء انتظامیہ کو مشورہ دوں گا کہ وہ حکومت کے اس فیصلے پر قائم رہے اور..... کی طرف ہمارا دروازہ کھلا رکھے۔ سوچیے تو سہی، آخر ہم اپنے ثقافتی کعبے سے کیسے پیٹھ موڑ سکتے ہیں''۔

جلسے کے بنگالی صدر نے جس کی اپنی وفاداری مشکوک تھی، میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بنگالی دانشور کی نکتہ آفرینی پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اجلاس برخاست کر دیا۔

مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے بنگالی بھائیوں سے رابطہ قائم کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک وسیع ذہنی خلیج حائل ہو چکی ہے۔ سوال یہ تھا کہ آیا یہ خلیج پاٹی بھی جا سکے گی یا اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا۔ معاً میرا ذہن ۲۵ ہزار فوجیوں کی طرف گیا جن کو مشرقی پاکستان میں قومی سالمیت کی حتمی گارنٹی سمجھا جاتا تھا۔

(بحوالہ کتاب: ''میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا'')

''شکستِ آرزو'' سے ایک باب

میرے آغاز میں میرا انجام پوشیدہ ہے!

پروفیسر سیّد سجاد حسین

سابق وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی ڈھاکا یونیورسٹی

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بارے میں جس قدر بھی غور کیجیے، ذہن اسی قدر الجھتا جاتا ہے۔ میں خانہ جنگی کے دوران رونما ہونے والے سفاک حالات کی بات نہیں کر رہا اور نہ یہاں فوجی حکمتِ عملی پر بحث مقصود ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے ذہنوں سے پاکستان کی اہمیت کا تصور اس قدر تیزی سے کس طرح کھرچ کر پھینک دیا گیا۔ ہمارے لیے پاکستان ایک بنیادی ضرورت تھا، مگر حیرت اس امر پر ہوتی ہے کہ ہمیں اس بنیادی ضرورت کے احساس سے ہی غافل کر دیا گیا۔ عوامی لیگ پورے مشرقی پاکستان پر اثرات نہیں رکھتی تھی۔ مگر ۱۹۷۱ء کے حالات نے اسے ایسی پوزیشن کا حامل بنا دیا کہ کوئی اسے چیلنج کرنے والا نہ رہا۔ جو لوگ عوامی لیگ سے اختلاف رکھتے تھے، وہ بھی اپنے اندر اس اختلاف کو برملا ظاہر کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ عوامی لیگ کے بعض مخالفین نے صورت حال کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا پینترا بدلا کہ وہ صوبائی مفادات کے تحفظ کا چیمپئن بننے کے معاملے میں عوامی لیگ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلتے دکھائی دیے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں ڈھاکا کی سڑکوں پر نوجوان مارچ کرتے ہوئے یہ نعرہ لگاتے تھے کہ انہیں اسلام آباد کے شکنجے سے نکالا جائے! لوگوں کو کس طرح اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کی زندگی اور اس کے تمام معاملات اسلام آباد یعنی پاکستانی حکمرانوں کے شکنجے میں ہیں۔ ہوسکتا ہے لوگوں کو خود بھی معلوم نہ ہو کہ یہ احساس کیونکر پیدا ہوا۔ دوسری طرف سرحد پار بھارت میں باغیوں کی خوب حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔ انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ جابر پاکستانی حکمرانوں کے خلاف وہ جو کچھ بھی کریں گے، اس میں انہیں بھارتی حکومت اور میڈیا کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی۔ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے ماضی میں ہندوؤں کے ہاتھوں بہت سی مشکلات سہی تھیں، مگر سب کچھ بھول کر وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ آزاد بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ بھارت کی مدد سے بھرپور ترقی کریں گے اور خوش حال زندگی بسر کریں گے۔ ہم جیسے لوگ، جو عوامی لیگ کے ساتھ نہ تھے، حالات کا رُخ دیکھ کر صرف حیران اور پریشان ہی ہو سکتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے خطے (مشرقی پاکستان) نے جس سیاسی بے بصیرتی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی عصر حاضر کی تاریخ میں کوئی مثال ملتی ہے یا نہیں۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے بنگال کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ تقسیم مسلمانوں کے مطالبے پر عمل میں آئی تھی۔ انگریزوں کے نزدیک اس فیصلے کی حیثیت انتظامی سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر انگریزوں نے ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر ۱۹۱۱ء میں اس تقسیم کو منسوخ کر دیا تھا۔ مشرقی بنگال اور آسام کے علاقوں کو ملا کر جو انتظامی یونٹ تشکیل دیا گیا تھا، اس کی ترقی کے امکانات دیکھ کر ہندوؤں نے انگریزوں کو ورغلایا اور مغربی بنگال میں ممکنہ خرابی سے ڈرا کر انہیں یہ فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا۔ بنگال میں مشرقی اور مغربی کی تقسیم کوئی نئی بات نہیں۔ یہ طویل داستان ہے، اس کی ایک تاریخ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی دونوں خطوں میں بہت فرق ہے۔ مشرقی بنگال دریائی علاقہ ہے۔ یہاں موسم غیر معمولی طور پر مرطوب رہتا ہے اور ہر سال سیلاب اور سمندری طوفان سے تباہی مچتی رہتی ہے۔ دوسری جانب مغربی بنگال میں موسم خشک اور غیر مرطوب رہتا ہے۔ شہری آبادی زیادہ ہے۔ صنعتی ڈھانچا مضبوط ہے۔ انگریزوں نے جب مغلوں کو شکست دی تو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے انہوں نے کلکتہ کو دارالحکومت بنایا۔ ہندو اور انگریز دونوں ہی مسلمانوں سے مخاصمت رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ایک ہو گئے اور کلکتہ کے ہندوؤں نے انگریز حکومت کے ایوانوں میں گہرا اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ ہندوؤں نے کلکتہ میں دارالحکومت ہونے کا خوب فائدہ اٹھایا۔ مغربی بنگال میں صنعتوں کا جال بچھا دیا گیا اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے بھی اسی علاقے میں قائم کیے گئے۔

انگریزوں نے ۱۹۱۱ء میں بنگال کی انتظامی تقسیم ختم تو کر دی، مگر انہوں نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ وہ ڈھاکا میں یونیورسٹی تعمیر کر دیں گے۔ ہندوؤں سے یہ بھی برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے انگریزوں کو ورغلانا شروع کر دیا کہ ڈھاکا میں

یونیورسٹی کے قیام سے کلکتہ میں یونیورسٹی کی تعلیم اور آمدنی متاثر ہوگی۔ کانگریس کے ایک وفد نے اس سلسلے میں وائسرائے سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ ڈھاکا میں یونیورسٹی کا قیام کوئی منفعت بخش فیصلہ نہ ہوگا، کیونکہ وہ ایک پسماندہ علاقہ ہے اور جہاں یونیورسٹی قائم کی جارہی ہے وہاں ناخواندہ لوگ رہتے ہیں۔ ہندو مسلم تاریخ اور دوطرفہ کشیدگی کے پیش نظر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو کن حالات کا سامنا تھا۔ ہندوؤں نے ایک طرف تو مشرقی اور مغربی بنگال کی تقسیم ختم کروا کر مسلمانوں کو پہنچ سکنے والے ممکنہ فوائد سے محروم کروا دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو تعلیم سے دور رکھنے کی سازش بھی جاری رکھی!

ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی۔ ہندوؤں نے حسد کے مارے اسے مکہ یونیورسٹی قرار دیا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لیے بنگالی اور انگریزی کے علاوہ عربی اور فارسی سکھانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ابتدا میں عملے کے بیشتر ارکان ہندو تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے شعبوں کے علاوہ دیگر شعبوں میں بڑے لمبے عرصے تک صرف چار یا پانچ ہی مسلم اساتذہ تھے۔ بنگالی میں ڈاکٹر شہیداللہ، تاریخ میں اے ایف رحمٰن، انگریزی میں ایم حسن اور ریاضی میں قاضی مطاہر حسین تھے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے قیام کے سترہ سال بعد ۱۹۳۸ء میں جب ہم نے یونیورسٹی میں قدم رکھا، اس وقت بھی صورتحال زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس وقت ڈاکٹر شہیداللہ تو تھے، مگر اے ایف رحمٰن ریٹائر ہوکر جاچکے تھے اور ان کی جگہ محمود حسین آئے تھے۔ انگریزی میں ایک نوجوان جلال الدین احمد کو کلاس ٹو کا لیکچرر مقرر کیا گیا تھا۔ معاشیات میں مظہرالحق تھے اور سیاسیات میں عبدالرزاق نئے بھرتی ہونے والے اساتذہ میں سے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ڈھاکا یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبے سے چند ماہ کے لیے وابستگی اختیار کی اور پھر مستعفی ہوکر چلے گئے۔ شعبۂ سائنس میں قاضی مطاہر حسین واحد مسلم لیکچرر تھے جنہیں کلاس ٹو کا گریڈ دیا گیا تھا۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں مسلم اساتذہ کی شدید قلت تھی اور یہ کسی سازش کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ حقیقتاً مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خال خال تھے۔ خالی اسامیوں پر بھرتی کے لیے لوگ نہیں ملتے تھے۔ جبکہ ہندو امیدوار بہتر قابلیت کے حامل ہوتے تھے اور ان میں نظم وضبط بھی ہوتا تھا۔ تعلیم وتعلم کے معاملے میں ان کا رویہ خالص پیشہ ورانہ تھا۔ یونیورسٹی کی گورننگ باڈی، جسے ایگزیکٹو کونسل کہا جاتا تھا، کے مسلم ارکان کو جلال الدین احمد کے تقرر کے لیے بہت زور لگانا پڑا تھا، کیونکہ ان کے پاس سیکنڈ کلاس ڈگری تھی۔ عبدالرزاق ہندو اور مسلمان، دونوں ہی کے لیے دردِ سر تھے۔ ان کے اطوار غیر روایتی تھے اور ان میں نظم وضبط کا بھی فقدان تھا۔ فرائض سے غفلت برتنا ان کی عادت تھی۔ وہ ہندوؤں کی تنقید کا نشانہ بنتے تھے اور مسلمانوں کو ان کے حوالے سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مظہرالحق نے کئی مواقع پر یونیورسٹی کے تسلیم شدہ قواعد کو ماننے سے انکار کیا۔ ان کا گورننگ باڈی سے بار بار تنازع کھڑا رہتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ڈھاکا یونیورسٹی میں کسی مسلم کلرک کے تقرر کو بھی مسلمان اپنی بڑی کامیابی تصور کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ڈھاکا یونیورسٹی ایک چھوٹا سا ادارہ تھی۔ طلبا کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ تین ہاسٹلوں میں سے ایک رہائشی ہال مسلمانوں کے لیے مختص تھا اور دوسرا ہندوؤں کے لیے۔ تیسرا ہال کسی کے لیے مختص تو نہ تھا، تاہم اس میں ہندو زیادہ تھے۔ مسلمانوں کے لیے سلیم اللہ ہال اور ہندوؤں کے لیے جگن ناتھ ہال مختص تھا۔ کاسموپولیٹن ہال کا نام ڈھاکا ہال پڑ گیا تھا، جسے بعد میں ڈاکٹر شہیداللہ سے موسوم کردیا گیا۔

۱۹۴۰ء کے بعد مسلم طلبا کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اب ان کے لیے ایک اور ہال مختص کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ جب یہ معاملہ صوبائی کابینہ میں منظوری کے لیے پیش ہوا تو وزیر خزانہ نالنی رنجن سین نے اس مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ایک اور کاسموپولیٹن ہال بنایا جائے۔ جبکہ خواجہ ناظم الدین نے ہال کو مسلمانوں کے لیے مختص کرنے پر زور دیا۔ بہرحال یونیورسٹی کی عمارت میں پہلی منزل پر ایک ہال کو عارضی طور پر خالی کرکے، اس وقت کے وزیر اعلیٰ اے کے فضل الحق کے نام سے موسوم کردیا گیا۔ جسے بعد میں مستقل ہال کے طور پر موجودہ نئی عمارت میں منتقل کردیا گیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک کا زمانہ داخلی اور خارجی اعتبار سے شدید مشکلات سے پُر تھا۔ ہندوستان کے بڑے حصے پر کانگریس کی حکومت تھی اور اس کے اندازِ حکمرانی نے ثابت کردیا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے سیاسی طور پر ساتھ رہنا کسی طور ممکن نہیں۔ مسلمانوں کو بار بار باور کرایا جارہا تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو انہیں اپنی جداگانہ تہذیبی شناخت ختم کرنا پڑے گی۔ مسلمانوں کی بنیادی زبان اردو خطرے میں تھی۔ مسلمانوں کے لیے آزادانہ طریقے سے عبادت ناممکن بنادی گئی تھی۔ وِدیا مندر ایجوکیشن اسکیم کے تحت مسلم طلبا کو ہندو بنانے کی سازش کی گئی۔ ان تمام مسائل کا حل کیا تھا؟ چند آئینی اصلاحات؟ کوئی اس بات پر کس طرح یقین کرسکتا تھا کہ اقتدار پر مکمل قابض ہونے کے بعد کانگریس مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرے گی، جبکہ فوج پر بھی اُسی کا کنٹرول تھا؟ یہ وہ پس منظر تھا جس میں علیحدگی کی بات کی جانے لگی تھی، مگر ہمیں خود بھی اندازہ نہ تھا کہ آگے چل کر یہ مطالبہ کیا شکل اختیار کرلے گا۔

بین الاقوامی سطح پر یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں ہٹلر کا عروج، اسپین میں خانہ جنگی اور وسطی یورپ کا سیاسی وسفارتی بحران دنیا کو ایک بار پھر بھرپور تصادم کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ہٹلر کی جانب سے معاہدوں کا عدم احترام، جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنا، یہودیوں کو مظالم کا نشانہ بنانا اور نسل پرستی سے متعلق نت نئے نظریات کا پرچار تہذیب اور شائستگی کے لیے، سولہویں صدی کے بعد شاید سب سے بڑا دھچکا تھا۔ اٹلی نے ایبی سینیا (موجودہ ایتھوپیا اور قرب وجوار) پر لشکرکشی کرکے ثابت کردیا تھا کہ لیگ آف نیشنز کسی کام کی نہیں اور یہ بین الاقوامی تنازعات روکنے یا ختم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اٹلی کے مسولینی کے مقابلے میں جرمن ایڈولف ہٹلر لیگ آف نیشنز کے لیے زیادہ تیزی سے موت کا باعث بن رہا تھا۔

مشرقِ بعید کی صورت حال بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ جاپان نے چین کے خلاف جارحیت جاری رکھی ہوئی تھی۔ وہ پورے مشرقی ایشیا پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا۔ جاپانی استعماریت بین الاقوامی سطح پر خرابی پیدا کررہی تھی۔ ہم اس زمانے میں طالب علم تھے۔ ہمیں جس قدر یورپ کے بارے میں معلوم تھا، اتنا مشرقِ بعید کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ اخبارات میں بھی یورپ میں ہونے والے واقعات کو زیادہ اور نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

ہمارے لیے خبروں کا ایک بڑا ذریعہ کلکتہ سے شائع ہونے والا اخبار ''دی اسٹیٹس مین'' (The Statesman) تھا۔ یہ ''ٹائمز آف لندن'' کی طرز پر شائع ہوتا تھا۔ اس کے ادارتی عملے میں یورپی باشندے شامل تھے۔ اس لیے اس کا معیار بھارت کے دیگر انگریزی اخبارات سے خاصا بہتر تھا۔ مسلمانوں کے قابل ذکر اخبارات برائے نام ہی تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اواخر میں ''دی اسٹار آف انڈیا'' کے نام سے شام کو چھپنے والا ایک روزنامہ جاری کیا تھا۔ لیکن اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے کوئی بھی تعلیم یافتہ مسلمان نہ مل سکا تھا۔ تب ہی جنوبی ہندوستان کے ایک عیسائی پوتھن جوزف کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔

بنگالی زبان میں مولانا اکرم خان کا اخبار ''آزاد'' ۱۹۳۶ء سے مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہا تھا۔ اس کی سرکولیشن محدود تھی اور اس میں بین الاقوامی خبروں کی اشاعت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ''دی آنند بازار پتریکا''، ''دی امرت بازار پتریکا''، ''فارورڈ''، ''جگانتر'' اور دیگر ہندو روزنامے دن رات مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو دی جانے والی معمولی سی رعایت بھی ان اخبارات سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ اس پر تنقید کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ اگر اسٹیبلشمنٹ میں مسلمانوں کو کوئی بڑا منصب مل جاتا تھا تو اس کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا جاتا تھا اور اسے فرقہ واریت اور اقربا پروری کا نام دے دیا جاتا تھا۔ وزیر اعلیٰ اے کے فضل الحق بیوروکریسی اور حکومتی مشینری کے کل پرزوں میں ہندو مسلم توازن برقرار رکھنے کے لیے چند مسلمانوں کو بطور کلرک بھی بھرتی کر لیتے تھے تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

بنگال میں ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے بعد مسلم لیگ کی وزارت نے حالات کچھ بہتر بنائے۔ ورنہ اس سے پہلے تو مسلمانوں کو سرکاری ملازمت کے حصول میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مسلم گریجویٹ بے روزگار رہا کرتے تھے۔ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ایک مسلم نوجوان، میرے عزیز، خان بہادر ایم اے مومن سے ملنے آیا، جو ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اعلیٰ حلقوں میں ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اُس نوجوان نے بتایا کہ فرسٹ کلاس ڈگری حاصل کرنے کے باوجود اسے ملازمت نہیں ملی۔ وہ اس بات پر تاسف کا اظہار کر رہا تھا کہ اس نے تعلیم پر خواہ مخواہ وقت اور وسائل ضائع کیے۔

سیاسی اعتبار سے بھی معاملات مایوس کن تھے۔ ہندو بہت اچھی سیاسی پوزیشن میں تھے اور وہ مسلمانوں کو اس میں کوئی حصہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو صوبائی مقنّنہ میں اقلیت کی حیثیت سے رہنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ رمزے میکڈونلڈ (Ramsay Macdonald) نے جس کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا تھا، رابندر ناتھ ٹیگور جیسی بلند پایہ ہستی نے بھی اس کی مذمت کی تھی۔ کمیونل ایوارڈ کا بنیادی مقصد بنگال میں اقلیتوں کو بھی سیاسی امور میں آواز اٹھانے کا موقع دینا تھا۔ کانگریس نے اس ایوارڈ کو انگریزوں کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول کا حصہ گردانا۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو اس بات پر زیادہ غصہ تھا کہ نچلی ذات کے ہندوؤں کو بھی ووٹ ڈالنے اور صوبائی مقنّنہ میں اپنے نمائندے بھیجنے کا اختیار دے دیا گیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے عشرے سے کچھ قبل میری اپنی سوچ یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ نمائندگی کا حق یا متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے کوئی آئینی فریم ورک کسی کام کا نہ تھا۔ میں نے اس زمانے میں علیحدگی کے بارے میں سوچنا شروع نہیں کیا تھا، اور نہ مسلم لیگ کی جانب سے الگ وطن کے قیام کا مطالبے کی حمایت شروع کی تھی۔ محمد علی جناح کی شخصیت بھی ہمارے لیے خاصی متاثر کن تھی۔ تاہم آزادی یا علیحدگی کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں بہت سی الجھنیں تھیں اور ہم اس بارے میں ابہام کا شکار تھے۔ مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کے حوالے سے پنڈت جواہر لعل نہرو سے محمد علی جناح کی بحث نے ہم میں خاصا ولولہ پیدا کیا تھا۔ نہرو کا موقف تھا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں۔ کانگریس اور انگریز۔ محمد علی جناح نے جواب میں کہا کہ فریق تو چار ہیں۔۔ انگریز، ہندو، مسلمان اور آزاد ریاستیں (رجواڑے)۔ پریس میں مسلم اور ہندو حقوق کے حوالے سے گرما گرم بحث ہمارے لیے غیر معمولی دلچسپی کا سامان تھی۔ اُس وقت میں خاصا الجھا ہوا تھا کیونکہ کوئی حتمی حل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری ذہنی الجھن اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک مرحلے پر میں اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ اگر ہم مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں رہنا ہے تو ہمیں علیحدہ ثقافتی اور مذہبی شناخت کا تصور ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ انہی دنوں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کی بات کی جانے لگی۔ اس مطالبے نے مجھ میں عجیب جوش وخروش بھر دیا۔ انہی دنوں روزنامہ دی اسٹیٹسمین میں ایک تجزیہ کار الکھ دھاری نے لکھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ ناقابل قبول ہے، کیونکہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان اس قدر یکجان ہو چکے ہیں کہ انہیں کسی معمے (Puzzle) کے حصوں کی طرح تقسیم کیے بغیر الگ کرنا ممکن نہیں۔ میں نے ''دی اسٹیٹس مین'' کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا، جس میں بتایا کہ الکھ دھاری کا تجزیہ کیوں غلط ہے اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں درست ہے۔ میں نے اس وقت تک یونیورسٹی کی پہلی ڈگری بھی حاصل نہیں کی تھی۔ میرے لیے یہ احساس ہی غیر معمولی مسرت کا آماخذ تھا کہ میں مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس خط کی کاپی میں نے سنبھال کر رکھی تھی جو ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ میں نے اس خط میں کشمیر اور حیدرآباد کے علاوہ مسلمانوں کی علیحدہ ریاست میں مسلم اکثریت کے حامل بھوپال، یوپی اور سی پی کے علاقوں کو بھی شامل کرنے کی بات کہی تھی۔ مجھے اس خط کی تاریخ تو اچھی طرح یاد نہیں تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں یہ واضح نہیں تھا کہ ہندوستان سے الگ ہونے کی صورت میں مسلمان آزاد ریاست یا ریاستوں کی حیثیت سے اپنے آپ کو کس طرح منظّم کریں گے، زندگی کس طور بسر کریں گے۔ میں اور میرے ساتھی یہ سوچتے تھے کہ ہندوستان سے الگ ہونے والے مسلم اکثریتی علاقے آزاد ریاستوں کی حیثیت سے قائم بھی رہ پائیں گے یا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی واضح نہیں تھا کہ وہ آپس میں اتحاد قائم کریں گے یا نہیں۔ جیسے ہی علیحدگی کی بات کھل کر کہی جانے لگی، ہم نے سکون کا سانس لیا کہ ہندوستانی سیاست کی پیچیدگیوں سے نجات کی یہی ایک صورت ہے۔

| | |

آراء قارئین

ڈاکٹر ممتاز احمد واقعی ایک ایسے دانشور تھے، جن کی دانش نے ملک وقوم کے لیے بہت سے چراغ روشن کیے۔ شہرت اور دولت کی ہوس سے دُور ڈاکٹر ممتاز احمد علم وآگہی کی جن منزلوں سے آشنا ہوئے، اپنے چاہنے والوں کو بھی ان منزلوں سے روشناس کرانے پر ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی دانش کو گرہ میں باندھ کر نہیں رکھا، بلکہ جو کچھ حاصل ہوا، دوست احباب اور شاگردوں میں تقسیم کر دیا؛ کبھی گفتگو کے ذریعے، کبھی تحریر کے ذریعے اور کبھی رویوں کی مدد سے۔ ان جیسے انسان قوموں کا سرمایہ ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر ممتاز احمد کو اللہ تعالیٰ نے ایسے دوستوں سے بھی نوازا، جو ان کی شخصیت کی قدر و قیمت سے بخوبی آشنا تھے۔ یہ سطور لکھتے ہوئے، مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ اگرچہ ان سے میری براہِ راست ملاقات نہیں ہوئی، لیکن ٹیلی فونک رابطوں کے سبب ان سے ہونے والی گفتگو سے مَیں نے اس قدر سیکھا ہے اور اس قدر جانا ہے کہ ان سے رابطہ ہونے سے قبل اور بعد کی زندگی میں بیّن فرق محسوس ہوتا ہے۔ وہ غیر محسوس طور پر اپنے مخاطب کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے اور زندگی کے مثبت رویوں سے سامع کے دل کو مرتسم کرتے چلے جاتے۔ میرے لیے اور میری ایک تالیف ''شبلی کی آپ بیتی'' کے لیے انھوں نے بڑی محبت سے لکھا۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، اب ان جیسے انسان ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی ملیں۔

(پروفیسر ڈاکٹر خالد ندیم، سرگودھا یونیورسٹی)

نیتن یاہو ''سفارت کاری''

Akiva Eldar

اسرائیل کے وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو نے ۲۵ نومبر کو کابینہ کو بتایا کہ چاڈ کے صدر ادریس دیبی کا دورۂ اسرائیل اس امر کا غماز ہے کہ اقوامِ عالم میں اسرائیل کا درجہ بلند ہو رہا ہے۔ اگلے ہی دن نیتن یاہو نے چیک جمہوریہ کے صدر میلوز زیمن کا خیر مقدم کیا جنہوں نے ازراہِ تفنّن کہا کہ وہ کوئی آمر تو ہیں نہیں کہ چیک جمہوریہ کے سفارت خانے کو تل ابیب سے (مقبوضہ) بیت المقدس منتقل کرنے کا اعلان کر دیں مگر خیر، وہ اس حوالے سے وہ سب کچھ کریں گے جو کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نیتن یاہو اور سوڈان کے صدر عمر البشیر کے درمیان رابطے ہیں۔ عمر البشیر کے خلاف جنگی اور انسانیت کے خلاف جرائم کے حوالے سے بین الاقوامی وارنٹ موجود ہے۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ اب عمر البشیر کے لیے وقت آ گیا ہے کہ اسرائیل سے رابطوں کا اعتراف کریں اور واشنگٹن میں اپنے ملک کی پوزیشن بہتر بنانے کے حوالے سے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے حوالے سے ''سفارتی کرنسی'' میں کچھ ادا کریں، یعنی اسرائیل سے باضابطہ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا اعلان کریں۔

اب یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اسرائیل نے چاڈ، سوڈان اور دیگر ممالک کو بیک ڈور چینل کے ذریعے اسلحہ بھی فروخت کیا ہے۔ چاڈ کے صدر ادریس دیبی نے مقبوضہ بیت المقدس میں کہا کہ اس صدی کے سب سے بڑے ناسور یعنی دہشت گردی پر چاڈ اور اسرائیل کا موقف یکساں ہے۔

اسرائیل کے موقر روزنامے ہاریز نے ۱۹/اکتوبر کی اشاعت میں ۱۵ ریاستوں کے ۱۰۰ سے زائد ذرائع کے حوالے سے بتایا کہ دنیا بھر میں مطلق العنان حکمران اپنے مخالفین پر نظر رکھنے اور بنیادی حقوق کچلنے کے لیے اسرائیل کے فراہم کردہ خفیہ آلات استعمال کرتے ہیں۔ خود نیتن یاہو کو یہ کہنے میں کچھ باک محسوس نہیں ہوتا کہ اسرائیل کو عالمی برادری میں بلند مقام دلانے کے لیے انہوں نے اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے کہ (مطلق العنان حکمرانی والی) ریاستوں میں معاشی امور سے متعلق ٹیکنالوجی کو سیکورٹی اور انٹیلی جنس سے متعلق آلات کے ساتھ جوڑ کر زیادہ سے زیادہ سیاسی و سفارتی گنجائش پیدا کی جائے۔

اسرائیلی وزیراعظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں کو اسلحہ اور جاسوسی کے آلات فروخت کر کے اور تعلقاتِ عامہ کے حوالے سے مساعی سے عالمی برادری میں اسرائیل کے لیے زیادہ گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے اور خود نیتن یاہو کے لیے بھی یہ سب کچھ سیاسی سطح پر غیر معمولی افادیت کا حامل ہے۔ نیتن یاہو کا خیال ہے کہ غیر معمولی نوعیت کی عسکری ٹیکنالوجی کے ذریعے وہ میڈیا میں زیادہ ایکسپوژر حاصل کر سکتے ہیں، نمایاں ہو سکتے ہیں۔ اس پورے معاملے میں نہ غرب اردن پر اسرائیلی قبضے کی کوئی بات ہوتی ہے نہ وہاں یہودیوں کو آباد کرنے کا کچھ ذکر ہوتا ہے۔ اور ہاں، غزہ کی پٹی میں فلسطینیوں کی اقتصادی ناکہ بندی کا تذکرہ بھی کسی سطح پر نہیں کیا جاتا۔ حال ہی میں نیتن یاہو کے عمان کے دورے، اس سے قبل جولائی میں ہنگری کے دارالحکومت بڈاپیسٹ کے دورے اور اپنے ملک میں چاڈ اور چیک جمہوریہ کے صدور کے خیر مقدم سے نیتن یاہو کی غیر معمولی اور منفرد اہلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ غرب اردن پر قبضہ مزید مستحکم کر سکتے ہیں، فلسطینیوں کو سفارتی سطح پر تنہا کر سکتے ہیں، یورپی برادری سے تعلقات بہتر بنا سکتے ہیں اور عرب مسلم دنیا کی طرف سے بائیکاٹ کی دیوار میں شگاف ڈال سکتے ہیں۔

ایسا پہلی بار ہوا ہے نہ آخری بار کہ نیتن یاہو نے عوام کے کمزور حافظے کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ نوجوان نائب وزیر خارجہ کی حیثیت سے انہوں نے ۱۹۹۱ء میں اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں امن کانفرنس میں بھی شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک درجن عرب ریاستیں بھی شریک ہوئی تھیں۔ دو سال بعد امریکا کی امن ٹیم کے سربراہ ڈینس راس نے کہا تھا کہ میڈرڈ کی امن کانفرنس میں اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان تعلقات کا بیج ڈالا گیا تھا۔ یہ جملہ اسرائیل کی وزارت خارجہ کے سابق ڈائریکٹر Eytan Ben-Tsur کی کتاب The Road to Peace Crosses Madrid سے لیا گیا ہے۔ اس امن کانفرنس نے روس اور چین کے دروازے بھی اسرائیل کے لیے کھولے۔ بھارت سے جامع سفارتی تعلقات کی راہ ہموار ہوئی اور جنوبی کوریا سے بھی قربت پیدا کرنے کا موقع پیدا ہوا۔

نیتن یاہو اس حقیقت کی بنیاد پر کام کر رہے ہیں کہ یورو میڈیٹیرینین پارٹنرشپ (جسے بارسلونا پروسیس بھی کہا جاتا ہے) کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں۔ اس شراکت داری کی ۲۳ ویں سالگرہ ۲۷ نومبر کو منائی گئی۔ شمعون پیریز کی حکومت میں تب کے وزیر خارجہ ایہود بارک نے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے، جس کے نتیجے میں اسرائیل کے لیے پہلی بار آزاد تجارت کی راہ ہموار ہوئی۔ اس معاہدے کے نتیجے میں

بقیہ: ''چپ وار''

راہ میں حائل ہونا شاید ممکن نہ ہو۔ جس طرح ''سلی کون ویلی'' کے عروج کی بڑی وجہ امریکی حکومت کی مدد تھی، بالکل اسی طرح چین بھی اس صنعت کو فروغ دینے کے لیے حکومتی اور کاروباری وسائل کا بے دریغ استعمال کر رہا ہے۔ چین نے ذہین لوگوں کو اپنی جانب کھینچنے کے لیے ایک مراعاتی پیکیج بنایا ہوا ہے۔ اس معاملے میں تائیوان پر خصوصی نظر رکھی جاتی ہے۔ چین کی Huawei جیسی کمپنیاں ایجادات کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ۲۰۱۵ء میں جب انٹیل پر ''چپ'' چین درآمد کرنے پر پابندی لگائی گئی تو اس پابندی نے چینی ''سپر کمپیوٹر'' کی صنعت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

اس وقت امریکا کے لیے موزوں حکمت عملی کے تین نکات ہیں۔ پہلا یہ کہ امریکا اپنے اتحادی ممالک اور یورپ کے ساتھ مل کر چین کی غیر قانونی کاروباری سرگرمیوں کو روکنے کے لیے WTO کے فورم پر آواز اٹھائے اور ایسی چینی سرمایہ کاری کو روکے جو قومی سلامتی کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ملک میں تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھائے اور اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ امریکی حکومت وسائل تو استعمال کر رہی ہے لیکن ''ٹیلنٹ'' کی تلاش کے لیے اپنے دل اور بڑے کرنے ہوں گے۔ اور تیسرا یہ کہ ایک ایسی دنیا کے لیے تیاری کرے جہاں چینی حاوی ہوں، جہاں ہر طرف چینی ٹیکنالوجی چھائی ہو۔ مطلب یہ کہ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے آپ کے پاس ٹیسٹنگ کی جدید ترین لیبارٹریاں موجود ہوں تاکہ چین سے درآمد کی گئی چیزوں کی سخت نگرانی کی جا سکے اور خاص طور پر ایسے آلات جن سے ''ڈیٹا'' منتقل کرنے کا امکان ہو، اس کی سخت چیکنگ ہونی چاہیے۔ اس طرح کے اقدام G-20 کے اجلاس کی شہ سرخیاں تو نہیں بن سکتے لیکن آئندہ کی دنیا پر اپنے اثرات ضرور مرتب کریں گے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Chip wars: China, America and silicon supremacy". ("The Economist". Dec. 1st, 2018)

اسرائیلی مصنوعات پر یورپی یونین میں ٹیرف کا بتدریج خاتمہ ہوا۔اس معاہدے کا یہی ایک میٹھا پھل نہ تھا۔۱۹۹۳ء میں فلسطینیوں سے ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں طے پانے والا امن معاہدہ بھی دی بارسلونا پروسیس ہی کا نتیجہ تھا۔ دی بارسلونا پروسیس کے دیگر ارکان میں الجزائر، تیونس، ترکی، اردن، لبنان، مالٹا، مصر، قبرص، فلسطینی اتھارٹی اور مراکش بھی شامل تھے، جبکہ لیبیا کو مبصر کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔ دی بارسلونا پروسیس کا بنیادی مقصد بحیرۂ روم کے خطے میں حقیقی اور پائیدار امن یقینی بنا کر خطے کے تمام ممالک کے درمیان اقتصادی اشتراکِ عمل کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا تھا۔۱۹۹۵ء میں اسرائیل اور یورپ کے درمیان دی ایسوسی ایشن معاہدہ طے پایا جو اب تک برقرار ہے جبکہ اسرائیل کی دائیں بازو کی حکومتوں نے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں یہودیوں کو آباد کرنے کا عمل روکنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔

اگر تب نیتن یاہو کی حکومت ہوتی تو یورپی یونین معاہدے پر دستخط ہرگز نہ کرتی کیونکہ نیتن یاہو انسانی حقوق کی سربلندی کے لیے کام کرنے والے ان اداروں کو بھی اذیت دینے سے باز نہیں آتے جنہیں یورپی یونین کی طرف سے امداد ملتی ہے۔ اگر ۱۹۹۳ء میں اوسلو میں امن معاہدہ نہ ہوا ہوتا تو اردن کبھی ۱۹۹۴ء میں اس امن معاہدے پر دستخط نہ کرتا جس کے نتیجے میں اس نے رامت گین میں سفارت خانہ کھولنے پر رضامندی ظاہر کی۔ یہ بھی طے ہے کہ اگر اس وقت اسرائیل میں نیتن یاہو کی حکومت ہوتی اور ان کی کابینہ میں نیفتالی بینیٹ اور ایلت شیکید جیسے انتہا پسند ہوتے تو اسرائیل خلیجی ریاستوں میں سفارتی مشن کھولنے میں کامیاب نہ ہوا ہوتا اور سعودی عرب و بحرین نے ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۵ء میں اسرائیل کے بائیکاٹ کے معاہدے سے الگ ہونا گوارا نہ کیا ہوتا۔

نیتن یاہو اس حقیقت سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں کہ کم ہی لوگوں کو ۲۷ نومبر ۲۰۰۷ء کو منعقدہ اینا پولس کانفرنس یاد ہوگی، جس میں سیاست کے مغربی نوگزے پیروں کے ساتھ مصر اور اردن نے بھی اس وقت کے امریکی صدر جارج واکر بش کی دعوت قبول کر کے اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم ایہود اولمرٹ اور فلسطینی مقتدرہ کے صدر محمود عباس کے ساتھ کھڑے ہونے کی دعوت قبول کی تھی۔ اینا پولس کانفرنس میں متحدہ عرب امارات، بحرین، عمان، سعودی عرب، قطر، یمن، عراق، پاکستان، ماریطانیہ، انڈونیشیا، ملیشیا، الجزائر، تیونس اور سینیگال نے بھی شرکت کی تھی۔ اسرائیلی وزیر اعظم اور فلسطینی اتھارٹی کے صدر نے دو ریاستوں کے نظریے کو قبول کرتے ہوئے یہودیوں اور فلسطینیوں کے لیے الگ الگ مگر ساتھ ساتھ ریاست کے قیام پر رضامندی ظاہر کی تھی اور طے کیا تھا کہ اس حوالے سے ایک سال کے اندر جامع سمجھوتے تک پہنچ جائیں گے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایہود اولمرٹ بدعنوانی کے الزامات پر جیل گئے اور نیتن یاہو کو وزیر اعظم بننے کا موقع مل گیا۔ اوسلو اور اینو پولس سے چلنے والی امن کی ہواؤں کی جگہ دہشت گردی اور ناکہ بندی کے جھکڑوں نے لے لی۔ ساتھ ساتھ قبضے اور اخراج کے جھکڑ بھی چلے۔ انصاف اور مساوات کی بنیاد پر کام کر کے آگے بڑھنے کے بجائے اسرائیل ہتھیار بیچ کر دوست خرید رہا ہے اور سفارتی معاہدوں کے ذریعے عالمی سیاست میں اپنا قد بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ۱۶ سال پہلے کے The Arab Initiative نے مسلم دنیا اور اسرائیل کے درمیان تعلقات بہتر بنانے اور ماحول کو پرامن رکھنے کے حوالے سے جو کچھ طے کیا تھا اس پر اب تک عمل کیا جا رہا ہے مگر اسرائیلی وزیر اعظم مطلق العنان حکمرانوں اور نسل پرست قائدین پر زیادہ متوجہ ہو کر اپنا اور اپنے ملک کا قد اونچا کرنے کی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Netanyahu's diplomacy: Buying friends by selling weapons".
("al-monitor.com". November 29, 2018)

| | |

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

ملنے کا پتا: اکیڈمی بک سینٹر: ڈی۔۳۵، بلاک۔۵
فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱(۰۲۱)

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ گزارش ہے کہ جب آپ کا پتا تبدیل ہو جائے تو براہِ کرم ہمیں اس کی تحریری اطلاع مع نیا پتا بلا تاخیر بھیج دیا کریں، تاکہ پچھلے پتے پر جا کر پرچہ ضائع نہ ہو۔ اگر ہمارا لکھا ہوا پتا ادھورا یا غلط نظر آئے تو تصحیح میں ہماری مدد فرمائیں۔

۲۔ کسی صاحب کو ''معارف فیچر'' ان کی خواہش کے بغیر جاری ہو گیا ہو یا اب اِسے لینا پسند نہ ہو تو گزارش ہے کہ براہِ کرم ہمیں اس کی اطلاع دینے کی زحمت ضرور کریں تاکہ پرچے کی ترسیل بند کی جا سکے۔

۳۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''معارف فیچر'' جاری ہو جانے کے بعد از خود بند نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب/ صاحبہ کو پرچہ بذریعہ ڈاک ایک بار بھی ملا ہو تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ بعد میں بھی ان شاء اللہ ملتا رہے گا، تا آنکہ وہ خود منع کر دیں۔ اگر پرچہ ملنا رُک گیا ہو تو اس کا سبب ترسیل کا بند ہونا نہیں، کچھ اور ہو سکتا ہے۔ مثلاً ڈاک والوں کی مہربانی یا پتا تبدیل ہو جانا۔ لہٰذا ''معارف فیچر'' بذریعہ ڈاک وصول کرنے والے اصحاب سے یہ گزارش بھی ہے کہ اس کے بند ہونے کی فوری تحریری اطلاع مع اپنے پورے نام اور مکمل و درست پتے کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں۔۔۔ ہم آپ کے تعاون، دعاؤں، مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔ (مدیر)

نوٹ:۔ زرِ تعاون اور عطیات کے چیک/ ڈرافٹ وغیرہ پر
Islamic Research Academy Karachi
لکھیے/لکھوائیے۔ براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجیے۔ خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:
D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201, 36349840

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950